زندگی بے بندگی شرمندگی

۶

صیامِ رمضان و حجِّ بیت اللہ

بنتُ الاسلام

زندگی بے بندگی شرمندگی

(حصہ ششم)

صیامِ رمضان
و
حج بیت اللہ

بنت الاسلام

ادارہ بتول، سید پلازہ، 30 فیروز پور روڈ، لاہور

طابع وناشر	.....	ادارہ بتول لاہور
مطبع	.....	
باراوّل	.....	۱۹۷۹ء
تیرہویں بار	.....	۲۰۰۱ء
پندرھویں بار	.....	۲۰۰۵ء

قیمت:۶۰روپے

ترتیب

تعارف 7

صیامِ رمضان

روزوں کی فرضیت اور فضیلت 12

فرضیت 12

رویتِ ہلال 15

فضیلت 16

نفل روزے 24

اعتدال 28

روزوں کی عمدگی 30

گناہوں سے پرہیز 30

روزے کے دوران نیکی کی طرف خصوصی توجہ 34

روزوں کی برکات 44

ضبطِ نفس اور روح کی پاکیزگی 44

نیکی کا اجتماعی ماحول 54

صبر اور سخت کوشی 57

امدادِ باہمی کا جذبہ 59

خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا احساس 60

بعض دوسرے فوائد 60

تلاوت کی فضیلت		63
	قرآن پڑھنے اور پڑھانے کی فضیلت	65
	تلاوت کی عمدگی	68
	خاص خاص سورتوں کی فضیلت	69
	خاص خاص آیات کی فضیلت	74
	قرآن پر غور و تدبر	76
تراویح تا آخری عشرہ اعتکاف، شب قدر		82
	تراویح	82
	آخری عشرہ	87
	اعتکاف	88
	لیلۃ القدر	90
	ماحصل	93
حج بیت اللہ		96
اللہ کے خلیل حضرت ابراہیمؑ		98
	عہد ابراہیمیؑ سے عہد نبویؐ تک	105
	مکہ مکرمہ	105
	قربانی	107
	بنائے خانہ کعبہ	109
	بعد کا زمانہ	112
	قبیلہ قریش	113
	عہد نبویؐ	113
حج کی تاکید اور فضیلت		116
	فضیلت	118

مقاماتِ حج		120
	مکہ مکرمہ اور حدودِ حرم	121
	مسجدِ حرام	125
	خانہ کعبہ	126
	حجرِ اسود	127
	ملتزم	128
	رکن یمانی	128
	حطیم	129
	میزابِ رحمت	132
	مطاف	133
	مقامِ ابراہیمؑ	133
	زمزم	134
	صفا مروہ	134
	منیٰ	135
	مزدلفہ	137
	عرفات	137
حج کا طریقہ		138
	احرام	138
	تلبیہ	139
	حالتِ احرام کی پابندیاں	140
	منیٰ میں قیام	143
	وقوفِ عرفات	143
	وقوفِ مزدلفہ	152
	وقوفِ منیٰ	153

	رمی	154
	قربانی	154
	حلق	156
	طواف	158
	سعی	162
	زمزم	165
	ایامِ تشریق	166
	رخصتی	167
	عمرہ	168
زیارتِ مدینہ		169
	فضیلتِ مدینہ	169
	مسجدِ نبویؐ	176
وتزودوا		181
	واقعی دِقتیں	185
	خود پیدا کردہ پریشانیاں	188
	حل	190
حج کی اجتماعی برکات		206
نئی زندگی		215
	اب آگے کیا ارادہ ہے؟	216

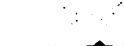

تعارف

یہ کتاب اپنے سلسلے کا چھٹا حصہ ہے۔ اس سے پہلے مندرجہ ذیل موضوعات پر پانچ تصانیف پیش کی جا چکی ہیں۔

۱۔ آخرت

۲۔ حبِ الٰہی

۳۔ داعی کے اوصاف

۴۔ نفس کا تزکیہ

۵۔ صلوٰۃ و زکوٰۃ

الحمد للہ کہ جن بہنوں، بھائیوں کے لیے یہ سلسلہ شروع کیا گیا تھا، انہوں نے اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا، جس کی علامت یہ ہے کہ عموماً ہر کتاب شائع ہونے کے بعد جلد ہی ختم ہو گئی اور دوسری اشاعت کی نوبت آتی رہی۔ حصہ اول، جو اسلام کے عقیدۂ آخرت سے تعلق رکھتا ہے، اب تک کم و بیش پانچ چھ دفعہ شائع کیا جا چکا ہے اور ایسے ہی حصہ دوم "حبِ الٰہی" بھی چار پانچ مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔ کتاب چونکہ پڑھی جانے والی شے ہوتی ہے، اس لیے جس کتاب کو بار بار شائع کرنے کی نوبت آئے، اس کے بارے میں یہی اندازہ لگایا جاتا ہے کہ وہ زیادہ پڑھی جا رہی ہے اور چونکہ یہ کتابیں کسی دنیاوی امتحان کے نصاب کا حصہ نہیں کہ لوگ امتحان پاس کرنے کے لیے انہیں پڑھنے پر مجبور ہوں۔ اس لیے

اگر یہ پڑھی جارہی ہیں تو غالباً اسی لیے پڑھی جارہی ہیں کہ پڑھنے والوں نے انہیں پسند کیا ہوگا۔

تاہم یہ علامت تو مخلوق کی پسندیدگی کی ہے۔ اب یہ کیسے پتہ چلے کہ خالق نے انہیں شرفِ پسندیدگی بخشا ہے یا نہیں۔ انسان ضعیف البنیان کے پاس کوئی ایسا مادی ذریعہ نہیں جس سے اسے پکے طور پر پتہ چل سکے کہ آیا اس کے مالک کے حضور میں اس کی عاجزانہ سعی قبول ہوئی ہے یا نہیں۔ جب تک وہ اس عالمِ آب وگل میں محصور رہتا ہے اس کا دل کانپتا ہی رہتا ہے کہ خدا معلوم انجام کیا ہوگا۔ جب تک تن اور روح کا رشتہ قائم رہتا ہے' یہ بے قراری اسے مضطرب کرتی ہی رہتی ہے کہ جب یہ رشتہ ٹوٹے گا' تو وہ کس مقام پر کھڑا ہوگا۔ آیا مقبولیت کے مقام پر' یا خدانخواستہ مردودیت کے مقام پر!!!۔

لہٰذا جو کام بھی اس غرض سے کیا جائے کہ اس کے ذریعے اپنے خالق و مالک کی خوشنودی حاصل ہو سکے' اس کے بارے میں حتمی طور پر یہ پتہ لگا لینا کہ ہاں وہ اس کے حضور میں قبول ہو ہی گیا ہے' انسان کے بس کی بات نہیں۔ کیونکہ اگرچہ یہ رائیگاں نہیں جانے دیتا' مگر یہ دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے کہ ہماری کوششیں ضرور خلوص ہی پر مبنی تھیں۔ دل میں خلوص کا موجود ہونا بھی تو انسان کے اپنے بس کی بات نہیں۔ یہ بھی صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کی رحمت ہی سے فریاد ہے کہ:

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ○

آخر میں ان کتب کے پڑھنے والوں سے بصد منت التجا ہے کہ انہیں پڑھتے ہوئے وہ اس مقصد کو ضرور پیشِ نظر رکھیں جس کی خاطر یہ لکھی گئی ہیں یعنی خود دین کے احکام پر عمل کرنا اور انہیں دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرنا۔ اگر ان کتب کو پڑھنے والی ہر بہن اور ہر بھائی یہ کوشش کرے کہ آگے پانچ اور آدمیوں کو انہیں پڑھا دے تو اس سے ان

خیالات کو پھیلانے میں انشاء اللہ بہت مدد ملے گی، جن کو پھیلانے کے لیے یہ سلسلۂ کتب شروع کیا گیا ہے۔ زندگی برق رفتاری سے اڑی جا رہی ہے۔ اس میں وہی لمحات مبارک ہیں جن میں ذکرِ الٰہی جاری رہے۔ حقوق العباد ادا کیے جائیں اور مخلوق کو اس کے خالق کا پیغام پہنچانے کی امکانی جدوجہد ہوتی رہے۔

بنت الاسلام

۱۳ جون ۱۹۷۹ء

صیامِ رمضان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم

اِذَا دَخَلَ رَمَضَانُ فُتِحَتْ اَبْوَابُ الْجَنَّۃِ وَغُلِّقَتْ اَبْوَابُ جَھَنَّمَ وَسُلْسِلَتِ الشَّیَاطِیْنُ۔ (بخاری و مسلم)

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور شیاطین جکڑ دیے جاتے ہیں۔''

روزے کی فرضیت اور فضیلت

عربی زبان میں روزے کو "صوم" کہا جاتا ہے' جس کا مطلب ہے "رکنا" اور "چپ رہنا"۔ شریعت میں روزہ اس بات کا نام ہے کہ انسان روزے کی نیت کر کے طلوع فجر سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے پینے اور بعض دوسری معینہ خواہشات کو پورا کرنے سے رکا رہے۔ رمضان کے روزے رکھنے کا حکم ہجرت کے دوسرے سال نازل ہوا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا سے تشریف لے جانے سے قبل نو رمضانوں کے روزے رکھے۔

فرضیت: جن آیات سے روزے فرض ہوئے وہ حسب ذیل ہیں:

"اے ایمان والو' تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جیسے کہ ان پر فرض کیے گئے تھے جو تم سے پہلے ہوئے۔ اس سے توقع ہے کہ تم میں پرہیزگاری کی صفت پیدا ہوگی۔ چند مقرر دنوں کے روزے ہیں' پھر اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کرلے' اور جو لوگ اسے مشکل سے برداشت کر سکیں وہ فدیہ دیں۔ ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے' اور جو کوئی اپنی خوشی سے نیکی کرے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے' لیکن اگر تم سمجھو تو تمہارے حق میں اچھا یہی ہے کہ تم روزہ رکھو۔ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا' جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔ لہٰذا

جو شخص اس مہینے کو پائے اس کو لازم ہے کہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرے۔ اللہ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے، سختی کرنا نہیں چاہتا (اس لیے یہ طریقہ تمہیں بتایا جا رہا ہے) تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو اور جس ہدایت سے اللہ نے تمہیں سرفراز فرمایا ہے، اس پر اللہ کی بڑائی بیان کرو اور تاکہ تم شکر گزار بنو۔" (البقرہ، آیات ۱۸۳ تا ۱۸۵)

ان آیاتِ مقدسہ سے مندرجہ ذیل باتیں اخذ ہوتی ہیں:

۱۔ رمضان کے مہینے کو روزے رکھنے کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے اور مسلمانوں کے لیے یہ لازم قرار دے دیا گیا ہے کہ وہ اس پورے مہینے کے روزے رکھیں پھر روزے کی فرضیت بتاتے ہوئے ساتھ اس بات کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے کہ روزہ وہ عبادت ہے جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے آنے والے انبیاء کی قوموں پر بھی فرض ہوتی رہی ہے۔

۲۔ اگر کوئی شخص بیمار ہو یا سفر کر رہا ہو تو اسے اجازت ہے کہ روزے چھوڑ دے اور رمضان کے بعد دوسرے دنوں میں اتنے ہی روزے رکھ کر رمضان کے روزوں کی گنتی پوری کرے۔ یہ طریقہ اس لیے بتایا گیا ہے کہ روزوں کا عدد بھی پورا ہو جائے اور لوگ زیادہ مشقت اٹھانے سے بھی بچ جائیں۔ اس ضمن میں اس بات کی بھی وضاحت فرما دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے لیے آسانی چاہتا ہے مشکل نہیں چاہتا۔

۳۔ اگر کوئی شخص بہت بوڑھا ہو یا بہت کمزور ہو یا صورت حالات ایسی ہو کہ اگر وہ روزہ رکھے گا تو اسے بہت نقصان پہنچے گا یا وہ بہت زیادہ تکلیف سے دوچار ہوئے بغیر روزہ نہ رکھ سکتا ہو تو اسے اجازت ہے کہ روزہ نہ رکھے اور اس کی جگہ ایک مسکین کو

کھانا کھلا کر روزے کا فدیہ ادا کر دے۔ ہر روزے کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہوگا۔

۴۔ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا تھا اور قرآن میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو وہ تعلیمات دی ہیں کہ جو ان پر عمل کرے گا وہ سیدھی راہ لگ جائے گا اور اسے وضاحت سے پتہ چل جائے گا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے۔

۵۔ جو شخص رمضان کے مہینے میں پابندی سے روزے رکھے گا' اس میں پرہیزگاری کی صفت پیدا ہو جائے گی۔

۶۔ روزے رکھنے کے لیے کوئی بڑا لمبا عرصہ متعین نہیں کیا گیا بلکہ سال کے بارہ مہینوں میں سے صرف ایک مہینہ اس کے لیے مخصوص کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ گیارہ مہینوں کے مقابلے میں ایک مہینہ تھوڑی مدت ہی ہے۔

۷۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو قرآن جیسی نعمت عطا کی ہے جس پر عمل کر کے وہ دونوں جہانوں کی خیر و برکت حاصل کر سکتے ہیں' اس لیے ان کے لیے لازمی قرار دیا گیا ہے کہ جس مقدس مہینے میں ان پر قرآن نازل ہوا تھا اس کے روزے رکھ کر اللہ تعالیٰ کے اس انعام کا شکر ادا کریں اور اس کے اس احسان پر کہ اس نے انہیں ہدایت دی ہے' اس کی کبریائی کا اظہار و اعتراف کیا کریں۔

ان آیات پر غور و خوض کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ ان میں انسان کو اس حقیقت سے مطلع کیا گیا ہے کہ قرآن پاک ایک عظیم انعام ہے جو اللہ نے انہیں عطا کیا ہے۔ اتنا بڑا انعام حاصل کرنے کے بعد منعم کا شکر ادا کرنا لازمی ہے۔ لہٰذا انہیں حکم دیا جاتا ہے کہ روزوں کی شکل میں اس رؤف و رحیم مالک کا شکر ادا کریں' جس کی رافت و رحمت کا واضح ثبوت یہ ہے کہ روزوں کو فرض قرار دے کر بھی اس نے قضا اور فدیے جیسی آسانیاں بہم

پہنچا دی ہیں۔ لہٰذا اس کے حکم کی تعمیل میں روزہ رکھنا ضروری ہے جو ایک طرف تو اظہارِ شکر کا ذریعہ ہے اور دوسری طرف اس سے انسان کے دل میں وہ طاقت اور قوت پیدا ہوتی ہے جس سے کام لے کر وہ گناہوں سے بچاؤ کر سکتا ہے۔

روزوں کی فرضیت کے سلسلے میں یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ جو شخص بغیر کسی شرعی عذر کے محض لاپروائی یا سرکشی کے باعث رمضان کا ایک روزہ بھی چھوڑ دے گا وہ اپنا اتنا بڑا نقصان کرے گا کہ اس کے بدلے میں اگر عمر بھر بھی روزے رکھتا رہے گا تو اس نقصان کی تلافی نہیں کر سکے گا۔ قانونی طور پر تو ایک چھوٹے ہوئے روزے کے عوض ایک روزہ ہی رکھنا ہوتا ہے مگر رمضان کے ایک روزے کو بھی بلاوجہ چھوڑ دینے سے انسان اللہ تعالیٰ کی خاص رحمتوں اور برکات سے جو محرومی حاصل کرتا ہے اس کی تلافی پھر عمر بھر کے روزے بھی نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ چھوڑے ہوئے روزے کے عوض وہ ایک روزہ رکھے یا زیادہ، وہ رکھے تو غیر رمضان ہی میں جائیں گے اور جو خاص الخاص برکات رمضان کے مہینے کو حاصل ہیں وہ دوسرے مہینوں کو تو حاصل نہیں۔ اس لیے جو شخص بلا عذر شرعی رمضان کا روزہ چھوڑتا ہے اسے سوچنا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کے ساتھ کتنی بڑی دشمنی کرتا ہے۔

رویت ہلال: روزوں کی فرضیت کے سلسلے میں رویتِ ہلال کے احکام کو بھی سمجھ لینا ضروری ہے۔ اسلامی سال قمری ہے یعنی چاند کے حساب سے چلتا ہے۔ جب پہلی تاریخ کا چاند نکلا تو پچھلا مہینہ ختم ہو کر اگلا مہینہ شروع ہو گیا۔ اس لیے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے کہ جب رمضان کی پہلی تاریخ کا چاند نظر آ جائے تو روزے رکھنے شروع کر دو اور پھر رکھتے رہو، یہاں تک کہ شوال کا چاند نظر آ جائے۔ قمری مہینہ یا انتیس کا ہوتا ہے یا تیس دن کا۔ اٹھائیس یا اکتیس دن کا نہیں ہوتا۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ ایک مہینہ ابھی انتیس دن ہی کا ہوا ہو کہ اگلے مہینے کا چاند نظر آ جائے۔ اس لیے رمضان سے پہلے والے

مہینے شعبان کے انتیس دن ختم ہو جائیں تو چاند دیکھ لینا چاہیے۔ اگر نظر آ جائے تو رمضان شروع ہو گیا اور اگر نہ نظر آئے تو شعبان کے تیس دن پورے کر کے روزے رکھنے شروع کر دیے جائیں۔ اسی طرح رمضان کے انتیس دن پورے ہونے پر چاند دیکھ لینا چاہیے' اگر نظر آ جائے تو اب تیسواں روزہ نہیں رکھا جائے گا بلکہ اس دن عید الفطر منائی جائے گی اور اگر چاند نظر نہ آئے تو پھر رمضان کے تیس روزے پورے کر کے پھر عید منائی جائے۔ انتیس روزے پورے ہونے سے پہلے اور تیس روزے پورے ہو جانے کے بعد چاند دیکھنا اس لیے ضروری نہیں ہوتا کہ قمری مہینہ' جیسے کہ اوپر بتایا جا چکا ہے' اٹھائیس یا اکتیس دن کا نہیں ہوا کرتا۔

حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کا ذکر کیا اور فرمایا کہ جب تک (رمضان کا) چاند نہ دیکھ لو' روزے رکھنے نہ شروع کرو اور (ایسے ہی) روزے رکھنے نہ چھوڑو جب تک کہ (شوال کا) چاند نہ دیکھ لو۔ اور اگر (۲۹ تاریخ کو) تمہیں چاند نظر نہ آئے تو اس کا حساب پورا کرو (یعنی مہینے کو تیس دن کا سمجھو) (بخاری)

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم شعبان کے دن اور اس کی تاریخیں جتنے اہتمام سے یاد رکھتے تھے' اتنے اہتمام سے کسی دوسرے مہینے کی تاریخیں یاد نہیں رکھتے تھے۔ پھر رمضان کا چاند دیکھ کر روزے رکھتے تھے اور اگر (۲۹ شعبان کو) چاند دکھائی نہ دیتا تو تیس دن کا شمار پورا کر کے پھر روزے رکھتے۔ (ابوداؤد)

فضیلت: اللہ تعالیٰ کے مبارک ناموں میں سے ایک نام "وَدُود" ہے یعنی "بہت زیادہ محبت کرنے والا" اور اس زیادتی محبت ہی کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ایسے احکام نہیں دیتا جو ان کی طاقت سے باہر ہوں۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ ان کی طاقت کے مطابق جو احکام دیے گئے ہیں ان میں بھی آسانی اور مشکل کے لحاظ سے درجے موجود ہیں یعنی بعض احکام ایسے

ہیں جن پر عمل کرنا ''بالکل آسان'' ہوتا ہے۔ بعض ان کی نسبت ''مشکل'' ہوتے ہیں مگر زیادہ مشکل نہیں ہوتے۔ بعض ''بہت مشکل'' ہوتے ہیں اور بعض ''بہت زیادہ مشکل'' ہوتے ہیں مگر یہ آخری قسم بھی مشکل ہونے کے اس درجے پر نہیں پہنچی ہوتی کہ انسان انہیں کر گزرنے پر قادر نہ ہو۔

مثال کے طور پر ذیل کی حدیث اور آیات پر غور کیجئے۔

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان پر اس کے مسلمان بھائی کے پانچ حقوق واجب ہیں۔

۱۔ سلام کا جواب دینا۔

۲۔ چھینکنے والے کو (اس کے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہنے پر) یَرْحَمُکَ اللّٰہ کہنا (جس کا مطلب ہے کہ خدا تم پر رحم فرمائے)۔

۳۔ دعوت قبول کرنا۔

۴۔ بیمار کی بیمار پرسی کرنا۔

۵۔ اور جنازے کے ساتھ جانا۔ (مسلم)

اب ان پانچوں اعمال پر غور فرمایئے کہ ان میں کون سا عمل ایسا ہے جسے ''مشکل'' کہا جا سکے۔ انسان کے دل میں اپنے مسلمان بھائی کے لیے کپٹ نہ بھرا ہوا' اور وہ انتہائی لاپروائی اور شدید قسم کی تن آسانی کا مریض نہ ہو' ورنہ تو یہ پانچوں نیک اعمال ایسے ہیں جو ایک عام مسلمان کے لیے بالکل آسان ہیں۔

اب ایک دوسرے فرمان کو دیکھئے۔ سورۃ الحجرات آیت ۱۲ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا (تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے)

اب بظاہر تو آپ کو یہی محسوس ہوگا کہ ایسی ہی کیا مشکل بات ہے غیبت سے بچنا۔ چلو نہیں کریں گے کسی کی غیبت، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس حکم پر عمل کرنا آسان نہیں اور اس کی مشکل کا صحیح اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو سنجیدگی سے اپنے آپ سے غیبت کی مذموم صفت کو دور کرنے کی کوشش میں مصروف رہے ہیں۔ انسان اپنے دل کے جذبات کے ہاتھوں کچھ ایسا بے بس ہو جاتا ہے کہ اسے پتہ بھی نہیں چلتا اور اس کی زبان سے وہ باتیں نکلنی شروع ہو جاتی ہیں جو صاف صاف غیبت کی تعریف میں آتی ہیں۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ غیبت سے بچنا ایک ''مشکل کام'' ہے۔

اب ایک اور فرمان پر غور کیجئے۔ کلام پاک میں اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ فرمایا ہے۔

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ۔ (نماز قائم کرو)

اب نماز پڑھنا جسمانی لحاظ سے تو کوئی بڑا مشقت طلب کام نہیں، تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ دن میں پانچ مرتبہ اہتمام سے کام، آرام یا گفتگو کو چھوڑ کر اٹھنا اور وضو کر کے نماز ادا کرنا سست طبائع پر گراں ضرور گزرتا ہے۔ سورۃ البقرہ آیت ۴۵ میں اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے:

وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ ط	''صبر اور نماز سے مدد لو۔ بے شک نماز ایک
وَاِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی	سخت مشکل کام ہے مگر ان کے لیے مشکل
الْخٰشِعِیْنَ لا	نہیں جن کے دلوں میں خشوع ہے۔''

چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ نماز ''بہت مشکل'' کام ہے، اگرچہ خدا سے سچی الفت اور اس کا حقیقی خوف رکھنے والوں اور آخرت کی کامیابی کے خواہشمندوں کے لیے یہ عین راحت ہے۔

اب ایک چوتھا حکم سنیے۔ سورۃ التوبۃ، آیت ۱۱۹ میں فرمایا گیا ہے:

وَجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط "اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔"

یہ مشکل ترین کام ہے کیونکہ اس میں جسمانی مشقت کے علاوہ اپنی جان کو بھی خطرے میں ڈالا جاتا ہے۔ اگرچہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ جہاد کر کے انسان زندہ سلامت واپس آجائے، مگر ایک سچا مجاہد جب جہاد کے لیے نکلتا ہے تو وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر ہی نکلتا ہے اور جان چونکہ انسان کو بہت زیادہ پیاری ہوتی ہے اس لیے وہ عمل جس میں جان چلی جاتی ہے۔ بلاشبہ "بہت زیادہ مشکل" کام ہے۔ اگرچہ تاریخ اسلام ان عاشقان زار سے بھری پڑی ہے جن کی سب سے بڑی آرزو یہی ہوتی تھی کہ وہ اپنی جان کو جان آفرین کی راہ میں نثار کر دیں۔

اب جب ہم روزے پر غور کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ روزہ خصوصاً موسم گرما کا روزہ، احکامِ دین کی ان چاروں قسموں میں سے تیسری قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی روزہ "بہت مشکل" ہے اگرچہ "بہت زیادہ مشکل" نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان اپنی مخصوص طبع اور میلانات کے لحاظ سے ہی کسی کام کو مشکل اور کسی کو آسان سمجھتا ہے۔ اس لیے ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جنہیں روزہ سب سے زیادہ آسان حکم معلوم ہوتا ہو۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ گرم علاقوں میں اور گرمیوں کے دنوں میں، جب کہ دن ویسے بھی بہت لمبا ہوتا ہے، روزہ رکھنا بلاشبہ "بہت مشکل" کام ہے۔ تاہم یہ حقیقت بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ اگر انسان کو ان فضیلتوں کا علم اور احساس ہو جو اللہ تعالیٰ روزہ دار کو عطا کرتا ہے اور اس کے دل میں سچا جذبہ ہو کہ جہاں ہمیشہ رہنا ہے وہاں زیادہ سے زیادہ عزت و وقار اور آرام و سکون حاصل ہو جائے تو پھر یہ "بہت مشکل" کام اس کے لیے عین راحت بن جاتا ہے۔ ذیل کی احادیث پاک اور ملفوظات واضح کیے دیتے ہیں کہ

اسلام میں روزے اور رمضان کے مہینے کی کتنی زیادہ فضیلت آئی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب رمضان (کا مہینہ) آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور شیطان زنجیروں میں کس دیے جاتے ہیں۔ (مسلم)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں اس حدیث کی تشریح میں جو کچھ فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ اس مبارک مہینے میں خدا کے نیک اور فرمانبردار بندے یادِ خدا اور نیک اعمال میں بہت مصروف رہتے ہیں اور ان سے متاثر ہو کر عام مومنوں کے دل بھی اعمالِ نیک کی طرف زیادہ متوجہ ہو جاتے ہیں' اس لیے رمضان کے دوران اسلامی معاشرے میں نیکی کی ایک ایسی فضا قائم ہو جاتی ہے جس کے زیر اثر تھوڑی سی صلاحیت رکھنے والے لوگ بھی نیک اعمال کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ رمضان کے دوران میں کی جانے والی نیکی کا اجر عام دنوں میں کی جانے والی نیکی کے اجر سے بہت زیادہ بڑھا دیا جاتا ہے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نیکی کے لیے کوشش کرنے والے لوگوں کے لیے جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور شیاطین انہیں گمراہ کرنے سے عاجز اور بے بس ہو جاتے ہیں ---- باقی رہے وہ خدا فراموش اور غفلت شعار لوگ جنہیں نہ رمضان سے کوئی سروکار ہے نہ روزوں سے اور نہ رمضان کے آنے سے ان کی زندگی میں کوئی تبدیلی آتی ہے تو مندرجہ بالا بشارت کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کے لیے تو گویا شیطان اسی طرح آزاد پھر رہے ہیں جس طرح سال کے باقی گیارہ مہینوں میں پھرتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ ہی نے ایک اور روایت بھی بیان کی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جب رمضان کے مہینے کی پہلی رات ہوتی ہے تو شیطان اور سرکش جن

زنجیروں میں جکڑ دیے جاتے ہیں اور دوزخ کے سب دروازے بند کر دیے جاتے ہیں کہ ان میں سے کوئی دروازہ بھی کھلا نہیں رہتا' اور جنت کے سب دروازے کھول دیے جاتے ہیں کہ ان میں سے کوئی دروازہ بند نہیں کیا جاتا اور ایک پکارنے والا پکارتا ہے کہ "اے خیر اور نیکی کے طالب' قدم بڑھا کر آگے آ' اور اے بدی اور بدکرداری کے طلب گار' رک جا' آگے نہ آ....." (ترمذی' ابن ماجہ)

حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے ایک مکتوب میں رمضان کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اس مہینے کو قرآن مجید کے ساتھ بہت خاص مناسبت ہے اور اسی مناسبت کی وجہ سے قرآن مجید اس مہینے میں نازل کیا گیا۔ یہ مہینہ ہر قسم کی خیر و برکت کا جامع ہے۔ آدمی کو سال بھر تک مجموعی طور پر جتنی برکتیں حاصل ہوتی ہیں وہ اس مہینے کے سامنے ایسے ہیں جیسے سمندر کے مقابلے میں قطرہ۔ اس مہینے میں جمعیتِ باطنی کا حصول پورے سال کی جمعیتِ باطنی کے لیے کافی ہوتا ہے اور اس میں انتشار اور پریشان خاطری بقیہ تمام دنوں بلکہ سارے سال کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ قابلِ مبارک ہیں وہ لوگ جن سے یہ مہینہ راضی ہو کر گیا' اور ناکام و بدنصیب ہیں وہ جو اس کو ناراض کر کے ہر قسم کی خیر و برکت سے محروم ہو گئے۔"

ایسے ہی آپؒ ایک اور مکتوب میں فرماتے ہیں کہ اگر اس مہینے میں کسی آدمی کو ٹھیک اعمال کی توفیق مل جائے تو پورا سال یہ توفیق اس کے شاملِ حال رہے گی اور اگر یہ مہینہ بے دلی' فکر و تردد اور انتشار کے ساتھ گزرے تو پورا سال اسی حال میں گزرنے کا اندیشہ ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی رمضان کے دوران جنت کے دروازوں کے کھل جانے'

دوزخ کے دروازوں کے بند ہو جانے اور شیاطین کے جکڑ دیے جانے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ان تمام چیزوں نے رمضان کو عبادت' ذکر' تلاوت اور زہد و تقویٰ کا ایک ایسا عالمی موسم اور جشن عام کا زمانہ بنا دیا ہے جس میں مشرق و مغرب کے تمام مسلمان' عالم و جاہل' امیر و فقیر' کم ہمت اور عالی حوصلہ' ہر قسم اور ہر گروہ کے لوگ ایک دوسرے کے شریک و رفیق' ہمدم و ہمساز نظر آتے ہیں۔ یہ رمضان ایک ہی وقت میں ہر شہر' ہر گاؤں اور ہر دیہات میں ہوتا ہے۔ امیر کے محل اور غریب کی جھونپڑی دونوں میں اس کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ کوئی شخص خودسری اور خود آرائی کرتا ہے نہ روزے کے لیے دنوں کے انتخاب میں کوئی انتشار اور جھگڑا پیدا ہوتا ہے۔ ہر وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے دو آنکھیں عطا کی ہیں' عالم اسلام کے وسیع و عریض رقبے میں ہر جگہ اس کے جلال و جمال کا مشاہدہ خود کر سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے میں نورانیت اور سکینت کا ایک وسیع شامیانہ سایہ فگن ہے۔ جو لوگ روزے کے معاملے میں ذرا سست اور کاہل ہیں وہ بھی عامۃ المسلمین سے علیحدگی کے ڈر سے روزہ رکھنے پر مجبور ہوتے ہیں اور کسی وجہ سے روزہ نہیں رکھتے تو چھپ کر اور شرم کے ساتھ کھاتے ہیں۔ سوائے ان چند ملحد اور فساق کے جن کو علانیہ بھی اس بے شرمی میں کوئی عار نہیں ہوتا یا ان بیماروں اور مسافروں کے جو شرعاً معذور ہیں۔ یہ ایک اجتماعی اور عالمی روزہ ہے جس سے خود بخود ایک ایسی سازگار اور خوشگوار فضا پیدا ہوتی ہے جس میں روزہ آسان معلوم ہوتا ہے' دل نرم پڑ جاتے ہیں اور لوگ عبادتوں اور طاعتوں اور ہمدردی و غمخواری کے مختلف کاموں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔''

جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذیل کی احادیث روزہ رکھنے کی فضیلت پر بہت اچھی طرح روشنی ڈالتی ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جس نے رمضان کے مہینے میں ایمان کے ساتھ اور ثواب حاصل کرنے کی نیت سے روزے رکھے۔ اس کے سابق گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔'' (بخاری)

حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے ایک اور روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''آدمؑ کے بیٹے کا ہر عمل بڑھتا رہتا ہے' اس طرح کہ ایک نیکی کا اجر دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک جا پہنچتا ہے مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ روزہ اس (عام قانون) سے مستثنیٰ ہے' کیونکہ وہ (ایک ایسا عمل ہے جو) خاص میرے لیے کیا جاتا ہے اور میں ہی (جتنی اور جس طرح چاہوں گا) اس کی جزا دوں گا۔ بندہ میری خاطر اپنی خواہشِ نفس اور کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے (پس میں خود ہی اسے اس کی اس قربانی کا ثواب عطا کروں گا) روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں۔ ایک خوشی (تو اسے) اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ روزہ کھولتا ہے اور دوسری اس وقت حاصل ہوگی جب وہ اپنے رب سے ملاقات کرے گا (اور اپنے روزوں کا اجر پائے گا) اور روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔'' (مسلم)

واضح رہے کہ ایک نیک نیت انسان جو عمل بھی کرتا ہے وہ خدا ہی کے لیے کرتا ہے اور اس کی جزا اس نے خدا ہی سے لینی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود روزوں کے بارے میں یہ جو فرمایا گیا ہے کہ ''روزہ خاص میرے ہی لیے رکھا جاتا ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔'' اس سے مراد روزے کی اہمیت واضح کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ خدا تعالیٰ روزوں کا بے حساب اجر دے گا۔

حضرت سہلؓ بن سعد بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جنت کے آٹھ دروازے ہیں' ان میں سے ایک دروازے کا نام ریان (یعنی سیرابی دینے

والا) ہے۔اس میں سے صرف روزہ دار ہی (جنت میں) داخل ہوں گے۔" (بخاری)

حضرت ابوسعیدؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ "جو شخص اللہ کی راہ میں ایک دن کا روزہ رکھے' اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کو دوزخ کی آگ سے ستر برس کی مسافت کے برابر دور فرمادے گا۔" (بخاری)

خود روزہ رکھنے کے علاوہ دوسرے روزہ داروں کو روزہ افطار کروانے کی بھی بہت فضیلت آئی ہے۔

حضرت زید بن خالد جہنیؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جس نے کسی روزہ دار کا روزہ افطار کروایا اس کو اتنا ہی اجر ملے گا جتنا اس روزہ دار کو ملے گا۔ بغیر اس کے کہ روزہ دار کے اجر میں سے کچھ کم ہو۔" (ترمذی)

حضرت ام عمارہ بنت کعب انصاریہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے تو انہوں نے حضورؐ کے سامنے کھانے پیش کیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ (تم بھی) کھاؤ تو انہوں نے عرض کیا کہ میں روزے سے ہوں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ بے شک روزے دار (کو وہ رتبہ حاصل ہے کہ) جب اس کے سامنے کھایا جاتا ہے تو جب تک (کھانے والے کھانے سے) فارغ نہ ہو جائیں' فرشتے روزہ دار پر رحمت بھیجتے رہتے ہیں۔ اور بسا اوقات (حضورؐ یوں) فرماتے کہ جب تک (کھانے والے) سیر نہ ہو جائیں (فرشتے روزہ دار پر رحمت بھیجتے رہتے ہیں۔) (ترمذی)

نفلی روزے: رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے فرض روزوں کے علاوہ عام دنوں میں نفلی روزے بھی رکھے ہیں اور کئی احادیثِ مقدسہ میں نفلی روزوں کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہر مہینے تین

دن (نفلی) روزے رکھا کرتے تھے۔ (نسائی)

حضرت ابوذرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے مہینے میں تین دن روزے رکھے اس نے گویا ہمیشہ روزے رکھے۔ پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں سچ فرمایا کہ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا (یعنی جس نے ایک نیکی کی اس کو دس گنا ثواب ملے گا) تو اس طرح ہر مہینے تین دن روزے رکھنے سے تیس دنوں کا ثواب مل جایا کرے گا۔ (نسائی)

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تین باتوں کا حکم دیا (ایک) سونے سے پہلے وتر پڑھنے کا (دوسرے) جمعے کے دن غسل کرنے کا اور (تیسرے) ہر مہینے تین دن روزے رکھنے کا۔ (نسائی)

حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پیر اور جمعرات کا روزہ رکھا کرتے تھے۔ (نسائی)

حضرت ابوذرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ جب تو مہینے میں کچھ روزے رکھے تو (مہینے کی) تیرھویں اور چودھویں اور پندرھویں تاریخ کے روزے رکھا کر۔ (نسائی)

ان تاریخوں کے روزوں کو "ایام بیض" کے روزے کہتے ہیں۔ ایام بیض کا مطلب ہے "روشن دن۔" چونکہ تیرھویں چودھویں اور پندرھویں تاریخ کی راتیں بہت روشن ہوتی ہیں اس لیے ان تاریخوں کا نام "ایام بیض" ہے۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جس نے رمضان کے روزے رکھے پھر رمضان کے بعد شوال کے چھ روزے (بھی) رکھے تو ایسا کرنا ہمیشہ روزے رکھنے کی مانند ہے۔" (مسلم)

شوال کے ان چھ روزوں کے بارے میں بعض لوگوں میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ عید الفطر کے دوسرے ہی دن یعنی ۲ شوال کو پہلا روزہ رکھ لینا ضروری ہے۔ مگر علماء نے صراحت کی ہے کہ شوال کے پورے مہینے کے کوئی چھ دن روزے رکھنے کے لیے مخصوص کیے جاسکتے ہیں۔

نفلی روزوں میں عاشورہ کے روزے کا ذکر بھی آتا ہے۔ عاشورہ دس محرم کو کہا جاتا ہے۔ احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ جب حضورؐ ہجرت فرما کر مدینے آئے تو یہود کو عاشورہ کا روزہ رکھتے دیکھا۔ حضورؐ کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ ہمارے ہاں یہ دن بہت عظمت والا ہے۔ اس دن خدا نے حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم کو نجات بخشی تھی اور فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کیا تھا تو حضرت موسیٰؑ نے شکرانے کے طور پر یہ روزہ رکھا تھا۔ اس لیے ہم بھی اس دن کا روزہ رکھتے ہیں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ موسیٰؑ سے ہمارا تعلق تم سے زیادہ ہے اور ہم اس کے زیادہ حقدار ہیں کہ اس دن کا روزہ رکھیں چنانچہ حضورؐ نے خود بھی عاشورہ کا روزہ رکھا اور امت کو بھی رکھنے کا حکم دیا۔ پھر اس خیال سے کہ یہود سے مشابہت نہ ہو اس بات کو پسند فرمایا کہ یوم عاشورہ کے روزے کے ساتھ ایک اور روزہ ملا کر دو روزے رکھ لیے جایا کریں یعنی یا تو ۹ اور ۱۰ محرم کے روزے رکھے جائیں یا دس اور گیارہ محرم کے۔ احادیث میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ پہلے حضورؐ نے امت کو یوم عاشورہ کا روزہ رکھنے کا حکم فرمایا تھا' پھر جب رمضان کے روزے فرض ہو گئے تو یوم عاشورہ کے بارے میں اجازت ہو گئی کہ جس کا جی چاہے رکھ لے اور جس کا جی چاہے نہ رکھے۔

حضورؐ یوم عرفہ یعنی ۹ ذوالحجہ کے روزے کا بھی خاص اہتمام فرمایا کرتے تھے اور اس کے علاوہ ذوالحجہ کے پہلے آٹھ دنوں میں بھی نفلی روزے رکھنا بہت اجر و ثواب کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔

غرضکہ فرضی روزے اور نفلی روزے دونوں بہت فضیلت رکھتے ہیں، مگر فرض روزوں کو بلا عذر چھوڑ دینے سے تو انسان سخت گنہگار ہوتا ہے اور نفلی روزے اگر رکھے جائیں گے تو بہت فضیلت کی بات ہے اور اگر نہ رکھے جائیں تو کوئی حرج نہیں۔ حضورؐ کا طریقہ یہ تھا کہ ہر ماہ نفلی روزے ضرور رکھا کرتے تھے۔ لیکن حضرت عائشہؓ کے بیان کے مطابق رمضان کے علاوہ کسی اور مہینے میں پورا مہینہ روزے نہیں رکھتے تھے۔

عبداللہ بن شقیق بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ کیا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم (رمضان کے علاوہ کسی اور مہینے میں) پورے مہینے کے روزے رکھتے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ مجھے معلوم نہیں کہ آپؐ نے رمضان کے علاوہ (کسی اور مہینے میں) پورے مہینے کے روزے رکھے ہوں، نہ آپؐ کوئی پورا مہینہ بغیر روزے رکھے ہی گزارتے تھے۔ آپؐ ہر مہینے میں کچھ دن روزے رکھ لیتے تھے (یہی آپؐ کا طریقہ رہا) یہاں تک کہ آپؐ رحلت فرما گئے۔ (مسلم)

ایسے ہی ایک اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ پیر اور جمعرات کو خصوصی طور پر روزہ رکھتے تھے۔

حضرت اسامہؓ بن زیدؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ (کبھی تو یوں ہوتا ہے کہ) آپؐ (نفلی) روزے رکھتے جاتے ہیں یہاں تک کہ (ایسے معلوم ہوتا ہے کہ اب) آپؐ روزے رکھنا چھوڑیں گے نہیں اور (کبھی ایسے ہوتا ہے کہ) آپؐ (نفلی) روزے (اتنی دیر) نہیں رکھتے کہ گویا اب آپؐ روزے رکھیں گے ہی نہیں مگر دو روزے (ایسے ہیں کہ) اگر وہ آپؐ کے روزے کے درمیان ہی آجائیں تو خیر ورنہ آپؐ انہیں (ضرور) رکھتے ہیں۔ (اس پر) حضورؐ نے فرمایا کہ وہ کون سے دو دن ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ پیر اور جمعرات۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ وہ دو دن ہیں جن میں (انسانوں کے)

اعمال رب العلمین کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ اس لیے میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ جب میرے اعمال پیش ہوں تو میں روزہ دار ہوں۔ (نسائی)

اعتدال: مندرجہ بالا احادیث سے فرضی اور نفلی دونوں طرح کے روزوں کی فضیلت ظاہر ہو جاتی ہے۔ اب یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ حضورؐ نے زندگی کے دوسرے امور کی طرح نفلی روزوں کے بارے میں بھی اپنی امت کو اعتدال کی تلقین فرمائی ہے اور اس بات کو ناپسند فرمایا ہے کہ کوئی شخص ہمیشہ ہی روزے سے رہے۔

صحابہ کرامؓ حبِ الٰہی اور خشیتِ الٰہی کی زیادتی کے باعث عبادت و ریاضت کی طرف بہت مائل رہتے تھے مگر حضورؐ انہیں اعتدال کی تلقین فرماتے رہتے تھے۔

حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ بن العاص بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں (میرے بارے میں) ذکر کیا گیا کہ میں کہتا ہوں کہ جب تک جیوں گا رات بھر عبادت کیا کروں گا اور دن بھر روزہ رکھا کروں گا۔ حضورؐ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ کیا تو نے ایسے کہا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ (جی ہاں) اے خدا کے رسولؐ میں نے ایسے کہا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ تو اس کی طاقت نہیں رکھتا۔ پس تو (نفلی) روزے بھی رکھا کر اور افطار بھی کیا کر اور (رات کو) سویا بھی کر اور عبادت بھی کیا کر اور مہینے میں تین دن روزے رکھ لیا کر۔ بے شک ہر نیکی کا ثواب دس گنا ہوتا ہے۔ اس لیے تیرا ایسے کرنا (یعنی ہر مہینے تین روزے رکھنا) ہمیشہ روزے رکھنے کی مانند ہو جائے گا۔ میں نے عرض کیا کہ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ (اچھا) ایک دن روزہ رکھا کر اور دو دن افطار کیا کر۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ (اچھا) ایک دن روزہ رکھا کر اور ایک دن افطار کیا کر۔ یہ حضرت داؤدؑ کے روزے ہیں (کہ وہ ایک دن روزہ رکھتے اور دوسرے دن نہ رکھتے) اور یہ سب سے زیادہ

اعتدال والے روزے ہیں۔ میں نے (پھر) عرض کیا کہ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔ (اس پر) حضورؐ نے فرمایا کہ اس سے بہتر کچھ نہیں۔ حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ (یہ بات بیان کر کے بعد میں) فرماتے ہیں کہ اگر میں حضور کی تین دن روزے رکھنے والی بات کو قبول کر لیتا تو (آج) وہ مجھے اپنے اہل وعیال اور اپنے مال سے زیادہ محبوب ہوتی۔ (نسائی)

حضرت عبداللہؓ کی مراد یہ تھی کہ اس وقت تو اصرار کر کے زیادہ روزے رکھنے کی اجازت لے لی مگر اب عمر کی زیادتی اور کمزوری کے باعث اتنے زیادہ روزے رکھنے مشکل ہو گئے ہیں۔ اگر میں حضورؐ کی پہلی بات ہی قبول کر لیتا یعنی ہر ماہ صرف تین روزے کافی سمجھتا تو آج مجھے بہت آسانی حاصل ہوتی۔

حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے ہمیشہ روزہ رکھا اس نے (گویا) روزہ رکھا ہی نہیں۔ (نسائی)

روزوں کے بارے میں حضورؐ نے جو کچھ احکام دیے اور ہدایات فرمائیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ فرض روزے رکھنا نہایت ضروری اور بہت فضیلت کی بات ہے۔ نفلی روزے رکھنا بہت اجر وثواب اور قربِ الٰہی کا ذریعہ ہے اور اعتدال کو نظر انداز کر کے ہمیشہ روزے سے رہنا بہت ناپسندیدہ عمل ہے۔

روزے کی عمدگی

روزے سے پورا فائدہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ روزہ رکھتے ہوئے ان تمام اصول وقواعد کا دھیان رکھا جائے جو اس کی عمدگی کی ضمانت ہیں۔ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کی روشنی میں پتہ چلتا ہے کہ روزے کو بہترین شکل میں رکھنے کے لیے مندرجہ ذیل امور کی طرف توجہ دینا نہایت ضروری ہے۔

۱۔ روزے کے دوران گناہوں سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرنا۔

۲۔ روزہ رکھ کر زیادہ سے زیادہ نیکیاں کرنے کی سعی کرنا۔

۳۔ سحری اور افطار کے معاملے میں شرعی احکام کا دھیان رکھنا۔ وغیرہ

۱۔ گناہوں سے پرہیز: حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جس نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا ہی نہ چھوڑا تو خدا کو اس بات کی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔" (بخاری)

یہ حدیث پاک واضح کر رہی ہے کہ روزہ رکھ کر اپنے اعضاء و جوارح کو گناہ سے بچانا بھی ضروری ہے، ورنہ اس روزے کی حیثیت فاقے ہی کی ہوگی جس کی خدا کو کوئی حاجت نہیں۔ روزے کے مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد یہی ہے کہ انسان کا نفس برائیوں سے پاک ہو اور وہ نیک اعمال اختیار کرے۔ اب جو شخص روزہ رکھ کر بھی اپنے آپ کو گناہوں سے نہیں بچاتا وہ روزے کے ایک بہت بڑے مقصد کو ختم کر دیتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''روزہ (عذاب الٰہی کے لیے) ڈھال ہے (یعنی اس کے ذریعے عذاب الٰہی سے بچاؤ ہوتا ہے) پس روزہ دار کو چاہیے کہ نہ فحش بات کہے نہ جہالت کرے اور اگر کوئی شخص اس سے لڑے یا اسے گالی دے تو وہ دو مرتبہ کہہ دے کہ میں روزہ دار ہوں۔'' (بخاری)

''میں روزہ دار ہوں'' یعنی چونکہ میں نے روزہ رکھا ہوا ہے اس لیے میں تمہاری جہالت کا جواب جہالت سے نہیں دے سکتا۔ اس لیے تم میرے ساتھ جہالت سے مت پیش آؤ۔

اب جو شخص پورے انتیس یا تیس دن اپنی زبان اور دوسرے اعضاء کو گناہوں سے بچانے کی کوشش جاری رکھے گا' اسے انشاء اللہ گناہوں سے بچنے کی مشق ہو جائے گی اور اس طرح ہر سال کی یہ تربیت اسے اس قابل بنا دی جائے گی کہ باقی گیارہ مہینوں میں بھی وہ پاک زندگی گزار سکے۔ اور اسی مقصد کے لیے اسے یہ مشق کرائی جاتی ہے۔

یہاں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ رمضان کے دوران گناہوں سے بچنے کی خاص ہدایت سے یہ مراد نہیں کہ باقی گیارہ مہینوں میں ان کی چھٹی دے دی گئی ہے بلکہ رمضان کے دوران کی خاص ہدایات سے مراد ہی یہی ہے کہ اس مبارک مہینے میں پرہیزگاری کی خصوصی مشق کی جائے تاکہ انسان کو پرہیزگار رہنے کی عادت ہو جائے اور وہ باقی گیارہ مہینوں میں بھی پرہیزگاری کی زندگی گزارے۔

سید علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ اپنی تصنیف ''کشف المحجوب'' میں روزے کے دوران کی احتیاطوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''پس روزے کی فرضیت ایک ماہ کے لیے ہے اور یہ حکم ہر بالغ و عاقل مسلمان پر عائد ہوتا ہے جو صحت مند اور مقیم ہو اور اس ایک ماہ کی ابتدا ماہ رمضان کا نیا چاند دیکھنے سے

ہوتی ہے، یعنی ماہ شعبان ختم ہوتے ہی اور روزہ رکھنے کے لیے اور بھی متعدد شرائط ہیں۔ مثلاً یہ کہ پیٹ کو کھانے اور پینے سے روکو تو چاہیے کہ آنکھ کو نظارۂ حرام اور نظرِ شہوت سے بچائے رکھو اور اسی طرح کان کو لغو باتوں کے سننے اور چغلی خوروں کی خرافات سے محفوظ رکھو۔ زبان کو بیہودہ گوئی اور فضول بکواس سے بچائے رہو اور تن کو دنیا کی غلامی اور شریعت کی خلاف ورزی سے محفوظ رکھو کہ روزہ تو درحقیقت اسی صورت میں صحیح ہوگا۔ کیونکہ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب تو روزہ رکھے تو تیری آنکھ، کان اور زبان کا بھی روزہ ہونا چاہیے۔ نیز فرمایا ہے کہ بہت سے روزہ دار ایسے ہوتے ہیں جنہیں بھوک اور پیاس کے سوا روزے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

روزے کے دوران جن امور کی ممانعت ہے ان میں بعض تو ایسے ہیں جو فی نفسہٖ جائز ہیں، صرف روزے کے دوران ان کی اجازت نہیں۔ مثلاً کھانا پینا وغیرہ۔ اور بعض ایسے ہیں جو روزے میں بھی منع ہیں اور فی نفسہٖ بھی ناجائز ہیں مثلاً جھوٹ، غیبت، دنگا فساد اور دوسرے گناہ اب یہ عجیب بات ہے کہ ہم لوگ روزہ رکھ کر تو ان امور سے بچتے ہیں جو فی نفسہٖ جائز ہیں مگر روزے میں ممنوع ہیں اور ان امور سے بچنے کی کچھ ضرورت محسوس نہیں کرتے جو روزے میں منع ہونے کے علاوہ فی نفسہٖ بھی گناہ ہیں۔

سید علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ ''کشف المحجوب'' میں روزے کے دوران اپنے تمام حواس کو قابو میں رکھنے کی نصیحت فرماتے ہیں۔ جو کچھ آپ نے فرمایا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پانچ حواس دیے ہیں دیکھنا، سننا، چکھنا، سونگھنا اور چھونا۔ روزہ دار کے لیے ضروری ہے کہ روزے کے دوران ان پانچوں حواس کو خدا کے احکام کے تابع رکھے۔ یعنی

اسی شے کو دیکھے جسے دیکھنے کی خدا کی طرف سے اجازت ہے۔

اسی بات کو سنے جسے سننا شریعت اسلامی میں حلال ہے۔

اسی چیز کو سونگھے جسے سونگھنے کو خدا نے جائز قرار دیا ہے۔

اسی شے کو چھوئے جسے چھونے سے خدا کی ناراضی حاصل نہ ہوتی ہو۔

اور چکھنے کے معاملے میں بھی اسی حد پر قائم رہے جو اللہ تعالیٰ نے باندھ دی ہے۔

عبادات کا معاملہ ہو یا دوسرے نیک اعمال کا ایک خاص ہدایت جو خدائے بزرگ و برتر اور اس کے مکرم رسولؐ کی طرف سے دی گئی ہے' یہ ہے کہ ریا اور دکھاوے سے پرہیز کی جائے۔ یہی احتیاط روزے کے معاملے میں بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ویسے صورت تو یہ ہے کہ روزے کا نظام فی الحقیقت ایسا ہے کہ اس میں ریا کی گنجائش ہی نہیں۔ کیونکہ اگر کوئی شخص کسی کے سامنے کچھ نہ کھائے مگر تنہائی میں جا کر کھا پی لے تو کسی کو کیسے پتہ چل سکتا ہے کہ اس نے روزہ رکھا ہے یا نہیں۔ اب جو شخص کسی کے سامنے بھی نہیں کھاتا اور تنہائی میں بھی اس پابندی کو قائم رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ خدا ہی کے لیے روزہ رکھ رہا ہے۔ تاہم اس بات کی گنجائش پھر بھی موجود ہے کہ انسان روزہ رکھ کر اپنے روزے کا اشتہار دیتا پھرے یا بار بار روزے کی تکلیف کا ذکر کرتا رہے اور اس طرح اپنے روزے کے حسن کو خراب کرے۔ اس لیے روزے جیسے ''ریا سے بالا'' عمل کے لیے بھی اس احتیاط کی طرف توجہ دلانا ہی پڑتی ہے کہ اسے دکھاوے کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔

بلاشبہ سارا دن بھوکے پیاسے رہنے کے باعث جسم کمزوری بھی محسوس کرے گا اور بھوک پیاس بھی ستائے گی' مگر ایک سچے مومن سے یہی توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ ان تکالیف کو صبر' حوصلے اور وقار کے ساتھ برداشت کرے۔ نہ زبان سے کسی تکلیف کا اظہار کرے اور نہ خواہ مخواہ نڈھال ہو ہو کر دکھائے بلکہ خوش و خرم رہے اور حتی الامکان کوشش کرے کہ تر و تازہ دکھائی دے' چہرے کی کیفیات بہت حد تک دل کی کیفیات کا پرتو ہوتی

ہیں۔ جو روزہ دار روزے کی تکالیف سہتے ہوئے مسرور و مطمئن ہوگا کہ الحمدللہ راہ خدا میں تکلیف سہنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے' انشاء اللہ اس کا چہرہ تھکن' سستی اور کمزوری کے اثرات سے بہت حد تک خالی رہے گا۔

ذرا موسم گرما کے لمبے لمبے دنوں کے دوران پیاس کی تکلیف کو تصور میں لائیے اور پھر سوچئے کہ جو انسان یہ سب تکلیف سہہ کر پھر دکھاوے کا شکار ہو جانے کے باعث اپنے روزے کے حسن کو خراب کر لیتا ہے' وہ کتنے خسارے کا سودا کرتا ہے!

اللہ رب العلمین فرماتا ہے کہ "روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔" اس لیے جو روزہ دار اپنے روزے سے پورا فائدہ اٹھانے کا خواہشمند ہو' اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنے روزے کو ہر چھوٹی بڑی آفت سے بچا کر صرف "خدا ہی کے لیے" رکھے تاکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اسے وہ اجر عطا فرمائے جس کی اس نے کوئی حد بندی بھی نہیں فرمائی' یعنی بے حساب اجر!

۲۔ روزے کے دوران نیکی کی طرف خصوصی توجہ: حضرت سلمان فارسیؓ بیان کرتے ہیں کہ شعبان کی آخری تاریخ کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایک خطبہ دیا۔ اس میں آپؐ نے فرمایا کہ اے لوگو' تم پر ایک عظمت اور برکت والا مہینہ سایہ فگن ہو رہا ہے' اس مہینے میں ایک رات ایسی ہے (یعنی شب قدر) جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مہینے کے روزے فرض قرار دیے ہیں اور اس کی راتوں میں (بارگاہ خداوندی میں) کھڑے ہو کر عبادت کرنے کو نفل عبادت مقرر کیا ہے۔ جو شخص اس مہینے میں خدا کی رضا اور قرب حاصل کرنے کے لیے کوئی (ایسا) بھلائی کا کام کرے گا (جسے نفل کی حیثیت حاصل ہوگی) تو اسے اتنا ثواب ملے گا جتنا دوسرے دنوں میں کوئی فرض کام کرنے سے ملتا ہے اور جس نے اس مہینے میں کوئی فرض ادا کیا تو اسے اتنا ثواب ملے گا جتنا دوسرے دنوں

میں ستر فرض ادا کرنے سے ملتا ہے اور یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا ثواب جنت ہے اور یہ باہمی ہمدردی اور غمخواری کا مہینہ ہے' اور یہ وہ مہینہ ہے جس میں مومن کا رزق بڑھایا جاتا ہے۔ جس نے اس مہینے میں کسی روزہ دار کا روزہ افطار کروایا تو ایسا کرنا اس کے لیے اس کے گناہوں کی بخشش کا اور اس کی گردن کے دوزخ سے نجات پا جانے کا ذریعہ بن جائے گا اور اس کو اتنا ہی اجر ملے گا جتنا اس روزہ دار کو' بغیر اس کے کہ روزہ دار کے اجر میں سے کچھ کم کیا جائے۔ (اس پر) ہم نے عرض کیا کہ اے خدا کے رسولؐ ہم سب کے پاس تو وہ سامان موجود نہیں ہوتا جس سے ہم روزہ دار کا روزہ افطار کروائیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ ثواب خدا اس کو بھی عطا فرما دے گا جو دودھ کی لسی کے ایک گھونٹ پر یا پانی کے ایک گھونٹ پر ہی کسی روزہ دار کا روزہ افطار کروا دے۔ اور جس نے روزہ دار کو سیر کیا اے اللہ میرے حوض (حوض کوثر) سے ایسا سیراب کرے گا کہ اس کے بعد اسے پیاس نہیں لگے گی یہاں تک کہ وہ جنت میں پہنچ جائے گا۔

اور (حضورؐ نے فرمایا کہ) رمضان ایک ایسا مہینہ ہے جس کا ابتدائی حصہ رحمت ہے اور درمیانی حصہ بخشش ہے اور آخری حصہ دوزخ سے آزادی ہے اور جس نے رمضان میں اپنے غلام سے کام کا بوجھ کم کر دیا' اللہ اسے بخشش دے گا اور آتش دوزخ سے رہائی عطا کرے گا۔ (شعب الایمان للبیہقی)

اس حدیث میں حضورؐ نے واضح فرما دیا ہے کہ جو نیکی رمضان کے دوران میں کی جائے اس کا اجر اس نیکی کی نسبت جو سال کے دوسرے دنوں میں کی جائے' بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اب جس شخص کے دل میں دینی اور دنیوی خیر و برکت حاصل کرنے کی سچی چاہت ہو گی وہ تو اس موقع کو انتہائی غنیمت سمجھے گا کہ تھوڑی مشقت کر کے اپنے لیے زیادہ بھلائی سمیٹ لے۔ جب اسے قلبی یقین ہو گا کہ اس مبارک مہینے میں تھوڑی سی محنت کر کے میں

جتنا اجر حاصل کرلوں گا اسے غیر رمضان میں ستر گنا محنت کرے ... کرے گا تو پھر وہ کیوں اس نادر موقع سے فائدہ اٹھانے کی سعی نہ کرے گا اور اس کا روزہ رحمتوں اور بھلائیوں کے لیے سعی کرنا اس کے روزے کو حسن اور عمدگی بخشے گا۔ حضورؐ کے اپنے طرز عمل سے بھی پتہ چلتا ہے کہ رمضان کے دوران حضورؐ خاص طور پر عبادت وریاضت ... بھلائیوں کی طرف بہت زیادہ توجہ فرمانے لگتے تھے۔

حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم خیر کی بخشش اور مخلوق خدا کو نفع پہنچانے میں اللہ کے سب بندوں سے فائق تھے اور رمضان المبارک میں آپ کی یہ کریمانہ صفت اور زیادہ ترقی کر جاتی تھی۔ رمضان کی ہر رات کو جبرئیلؑ آپؐ سے ملتے تھے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم انہیں قرآن سناتے تھے۔ پس جب حضرت جبرئیلؑ آپؐ سے ملتے تو آپ کی اس کریمانہ نفع رسانی اور خیر کی بخشش میں خدا کی بھیجی ہوئی ہواؤں سے بھی زیادہ تیزی آجاتی تھی۔ (بخاری)

لہٰذا ہر وہ روزہ دار جو اپنے روزے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا خواہشمند ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ روزہ رکھ کر اپنے وسائل وذرائع کے لحاظ سے زیادہ سے زیادہ نیکی کرنے کی کوشش کرے۔ نیکیوں کی ایک قسم تو یہ ہے کہ خالق کا ذکر اور عبادت کی جائے اور دوسری یہ ہے کہ مخلوق کو نفع پہنچانے کی کوشش جاری رہے۔ قرآن پاک کی تلاوت کرنا، نماز تراویح ادا کرنا۔ اس کے علاوہ کلمات ذکر، کلمہ شریف اور درود شریف وغیرہ کا ورد رکھنا، غریبوں کی مالی امداد کرنا، بیماروں کی تیمارداری کرنا، لوگوں کو درس وتدریس یا زبانی گفتگو کے ذریعے ہدایت کی راہ دکھانا، ضرورت مندوں کے کام کر دینا، حاجت مندوں کی حاجتیں پوری کرنا، نیکی اور بھلائی کے کاموں میں شرکت کرنا، مجالس خیر میں جا کر شامل ہونا، گھر کے ملازموں کے کاموں میں کمی کر دینا یا کام کرنے میں ان کی امداد کرنا، اہل

خانہ کو زیادہ آرام پہنچانے کی کوشش کرنا۔ یہ سب وہ نیکی کے کام ہیں جو اپنے ساتھ بے پناہ اجر لاتے ہیں۔

ایک نیک بخت خاتون نے' جو اب اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں' اپنا یہ طریقہ بنایا ہوا تھا کہ جیسے ہی رمضان شروع ہوتا وہ اہلِ محلّہ میں سے تنگدست عورتوں کے کپڑے سینا شروع کر دیتیں۔ اپنے اوپر ذمہ داریاں اتنی تھیں کہ ان کے لیے خود کپڑا خریدنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے کپڑے تو غریب عورتیں خود خرید لیتیں مگر سلائی یہ خاتون کر دیتیں۔ غریب طبقے کی عورتوں کے پاس عموماً نہ تو سینے کی مشینیں ہوتی ہیں اور نہ انہیں کپڑے سینے آتے ہی ہیں۔ اس لیے کپڑے بناتے ہوئے ان پر دہرا بوجھ پڑتا ہے کہ ایک تو کپڑا خریدنے پر پیسے صرف کریں اور پھر سلائی کی رقمیں دے کر انہیں سلائیں۔ ان کا آدھا بوجھ جب یہ نیک بی بی بٹا لیتیں اور ان کے سلائی کے پیسے بچ جاتے تو اس سے غریب عورتیں بے انتہا خوش ہوتیں اور بڑے چاؤ سے اپنے اور اپنے خاوندوں اور بچوں کے لیے عید کے کپڑے سلواتیں۔ ان خاتون کا یہ طرزِ عمل کہ وہ رمضان کے دوران غریب گھرانوں کے کپڑے سیتی رہتیں' محلے کے غریب گھروں میں خوشی اور مسرت کی ایک لہر دوڑا دیا کرتا تھا۔ جب وہ ان لوگوں کے کپڑے سی رہی ہوتیں تو جن عورتوں کے کپڑے سل رہے ہوتے' وہ اور ان کے بچے کمال خوشی سے ان کے پاس بیٹھ کر اپنے کپڑے سلتے دیکھتے رہتے اور ساتھ ساتھ تبصرے کرتے رہتے کہ یہ کپڑا تو وہ آخری جمعے کے دن پہنیں گے اور یہ عید کے دن زیبِ تن کریں گے۔ اس طرح سارا رمضان وہ غریب محلے داروں کی خوشیوں کا ذریعہ بنی رہتیں اور ان کی قلبی دعائیں اور محبتیں سمیٹتی رہتیں!

اسی مثال پر قیاس کر کے اور بے شمار ایسے طریقے سوچے جا سکتے ہیں جن سے کام لے کر انسان رمضان کے دوران نیکیاں سمیٹ سکتا ہے۔ ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ

اپنے اپنے وسائل و ذرائع کی مناسبت سے اپنے لیے ایسی نیکیاں چن لے جو اسے رمضان کے دوران میں زیادہ سے زیادہ خیر و برکت دلا سکیں۔ اہلِ ثروت حاجت مندوں کی امداد کی طرف دھیان دیں اور جو تنگدست ہو مگر علم دین رکھتے ہوں اور لکھنا بولنا جانتے ہوں' وہ لوگوں کو ہدایت دینے کی طرف توجہ دیں اور جن کے پاس یہ بھی نہ ہو مگر ہوں تندرست' وہ حاجتمندوں کے جسمانی کام کر کے ہی نیکیاں سمیٹنے کی سعی کریں۔ غرضکہ ہر شخص اپنی مخصوص صلاحیتوں اور اپنے وسائل سے کام لے کر زیادہ سے زیادہ بھلائی کے لیے کوشش کرے اور تلاوت قرآن پاک' تراویح اور عبادت و ریاضت تو غریب امیر سبھی کے کرنے کے کام ہیں۔ پھر اپنے آپ کا محاسبہ کرتے رہنا اور یہ کوشش کرنا کہ ہم رمضان کے دوران میں اپنی عادات کی زیادہ سے زیادہ اصلاح کر لیں' یہ بھی ایک ایسی مصروفیت ہے جو روزہ دار کی توجہ چاہتی ہے اور اس میں پیسے کی کمی یا زیادتی کا بھی کوئی دخل نہیں۔ خوشحال کو بھی اپنی اصلاح کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی تنگدست کو' اور غریب بھی عموماً تزکیہ نفس کا اتنا ہی محتاج ہوتا ہے جتنا امیر۔ اس سلسلے میں یہاں ایک خاتون کے طریقِ کار کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس خیال سے کہ شاید یہ کسی اور کے لیے بھی مفید ثابت ہو۔

ان کا کہنا ہے کہ رمضان کے دوران میں میں آئندہ آنے والے پورے سال کا پروگرام طے کرتی ہوں۔ رمضان کے آخری عشرے میں پہلے استخارہ کر کے خدا سے دعا کرتی ہوں کہ وہ میری رہنمائی کرے اور پھر عموماً ستائیسویں کی رات کو ذکر و دعا کر کے غور و فکر میں مصروف ہو جاتی ہوں کہ آئندہ سال رمضان سے پہلے پہلے میں نے کیا کیا کام کرنے ہیں۔ عام گھرداری کے کاموں سے لے کر ذاتی مطالعہ اور تبلیغی سرگرمیوں تک تمام اقسام کے کاموں کا ایک نقشہ مرتب کر لیتی ہوں۔ اس نقشے میں پہلے تو یہ طے ہوتا ہے کہ پورے سال میں کون کون سے کام کس حد تک کرنے ہیں' مثلاً:

پورے سال میں کلام پاک کتنی دفعہ ختم کرنا ہے۔

سارے سال میں حدیث کا علم کہاں تک حاصل کرنا ہے۔

کتنی کتب کا مطالعہ کرنا ہے۔

تبلیغ دین کے مسلسل میں کیا کیا کام کرنے ہیں مثلاً اجتماعات کتنے کیے جائیں۔ مضامین وغیرہ کتنے لکھے جائیں' ملاقاتیں کتنی کی جائیں۔

تزکیہ نفس کے سلسلے میں اپنی کس کس خاص خامی کو دور کرنا ہے۔ گھر کی ضروری اشیاء میں سے کون کون سی چیز اس سال کے دوران بنانی ہے۔ مثلاً بستر یا گھر کا دوسرا ضروری سامان۔

بچوں کی تربیت اور تعلیم کے سلسلے میں کن چند خاص مقاصد کو حاصل کرنا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد پھر یہ طے ہوتا ہے کہ ان میں سے کون کون سے کام روزانہ کیے جانے والے ہیں' کون کون سے ہفتہ وار اور کون کون سے ماہوار' اور پھر ان کا ٹائم ٹیبل بنالیتی ہوں اور کوشش کرتی ہوں کہ روزمرہ اور ہفتہ وار اور ماہوار کام اس ٹائم ٹیبل کے مطابق ہوں۔

انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اگر میں یہ کہوں کہ جو پروگرام میں طے کر لیتی ہوں اور جو ٹائم ٹیبل بنالیتی ہوں' ٹھیک اسی کے مطابق پورا سال گزرتا ہے تو یہ غلط ہوگا۔ کیونکہ حالات میں چھوٹی موٹی تبدیلی آئے دن آتی ہی رہتی ہے اور اس کے مطابق میں اپنے ٹائم ٹیبل میں جزئی تبدیلیاں کرتی رہتی ہوں اور بعض اوقات بیماری' سستی' گھریلو کاموں کی زیادتی یا کسی ناگہانی حادثے کے باعث میں کئی کئی ہفتے اپنے طے شدہ پروگرام اور ٹائم ٹیبل کے مطابق کام نہیں کر سکتی۔ تاہم ستائیسویں کی رات کو جو پروگرام اور ٹائم ٹیبل میں اپنے آئندہ سال

کے لیے بناتی ہوں' اللہ کی خصوصی رحمت اور فضل وکرم کے باعث وہ مجھے بے پناہ فائدہ دیتا ہے اور جب سے یہ کام شروع کیا ہے میری قوتِ کار بھی آگے سے بہت بڑھ گئی ہے۔ کاموں میں نظم ضبط بھی نسبتاً زیادہ پیدا ہو گیا ہے اور کام بھی بہ حیثیتِ مجموعی پہلے سے بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔

انہوں نے یہ بھی کہا کہ میرا ایمان ہے کہ اس کی اصل وجہ میرا بنایا ہوا پروگرام اور ٹائم ٹیبل نہیں بلکہ یہ مبارک مہینہ' یہ مبارک رات اور وہ دعائیں ہیں جو میں اپنے سال بھر کے کاموں کا خاکہ تیار کرنے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی کرتی ہوں!

یہ بات یہاں صرف اس لیے بیان کی گئی ہے کہ بسا اوقات ایک انسان کے تجربات یا سوچ دوسرے بے شمار انسانوں کو سوچ کی نئی نئی راہیں سجھا دیتی ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ سال کا یہ مہینہ بہت زیادہ بابرکت اور عظمت والا ہے۔ ہماری یہ تمنا ہونی چاہیے کہ اس سے جتنی زیادہ برکت حاصل کر سکیں' کر لیں۔ انسان اپنے نفع کے معاملے میں حریص واقع ہوا ہے اور اسے اپنے نفع کے لیے حریص ہی ہونا چاہیے۔ اس کی اس ''حرص'' کا اچھا یا برا ہونا اور اس کا اللہ کے حضور پسندیدہ یا ناپسندیدہ ہونا منحصر ہے اس بات پر کہ وہ کس شے کو ''نفع'' سمجھتا ہے۔ کیا اسی عارضی دنیا کے عارضی اور حقیر مال و دولت اور ساز و سامان اور عہدہ و جاہ کو؟ یا اس ہمیشہ رہنے والی زندگی کے دائمی سکھ آرام' سکون و آرام اور عزت و مرتبہ کو؟ جن کی حرص اول الذکر کے لیے ہے' ان کی حرص کمینی اور احمقانہ ہے اور اللہ تعالیٰ اس حرص کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اہلِ دنیا میں سے بھی دانشمند لوگ اسے قابلِ نفرین ہی سمجھتے ہیں اور جن کی حرص آخر الذکر کے لیے ہے' ان کی حرص سیر چشمی اور دانائی پر مبنی ہے اور خالق و مخلوق دونوں اس حرص کو قابلِ احترام اور ازحد پسندیدہ سمجھتے ہیں۔

سحری و افطار کے اصول: رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے سحری اور افطار کے بارے

میں خصوصی ہدایات دی ہوئی ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ سحری ضرور کھائی جائے اور افطار ٹھیک وقت پر کر لی جائے خواہ مخواہ دیر نہ لگائی جائے۔

حضرت انسؓ بن مالک بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''سحری کھاؤ کیونکہ سحری کھانے میں برکت ہے۔'' (بخاری)

حضرت عمروؓ بن العاص بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''ہمارے اور اہل کتاب کے روزوں میں صرف سحری کے لقمے کا فرق ہے۔'' (مسلم)

یعنی اہل کتاب سحری نہیں کھاتے اور ہم سحری کھاتے ہیں۔ سحری کی برکت واضح ہے کہ جو شخص سحری کھا کر روزہ رکھے گا وہ روزے کو بہتر طور پر برداشت کرے گا بہ نسبت اس شخص کے جو سحری نہیں کھائے گا۔

اس کے علاوہ سحری کی اپنی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس سے انسان کو نیند توڑ کر اٹھنے اور روزے کا اہتمام کرنے کی مشق ہوتی ہے اور اس طرح سستی اور نفس پر قابو حاصل ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کو اس طرح پچھلے پہر نیند چھوڑ کر اٹھنا اتنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ وہ رات کے پہلے پہر ہی روزے کی نیت کر لیتے ہیں اور بغیر سحری کھائے روزہ رکھ لیتے ہیں حالانکہ یہ امر اتنا پسندیدہ نہیں جتنا پسندیدہ یہ طریقہ ہے کہ حضورؐ کے فرمان کے مطابق سحری کے وقت سحری کھا کر روزہ رکھا جائے۔ اب یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ جس نے سحری نہیں کھائی اس کا روزہ نہیں ہوا' تاہم یہ ضرور ہے کہ حضورؐ کی ہدایات کے مطابق روزہ رکھنا زیادہ عمدہ اور زیادہ پسندیدہ روزہ ہوتا ہے۔

سحری کی طرح افطار کے بارے میں بھی ہدایات دی گئی ہیں کہ غروب آفتاب کے ساتھ ہی افطار کر لیا جائے۔

حضرت سہلؓ بن سعد بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

''لوگ ہمیشہ بھلائی پر رہیں گے جب تک کہ افطار جلدی کرتے رہیں گے۔'' (مسلم)

ظاہر ہے کہ ''جلدی'' سے یہ تو مراد نہیں کہ ابھی سورج موجود ہی ہو اور روزہ دار روزہ افطار کر لے بلکہ جلدی یہ ہے کہ جیسے ہی سورج غروب ہو روزہ کھول لیا جائے اور خواہ مخواہ دیر نہ کی جائے۔ اس سلسلے میں حضورؐ کی ایک اور حدیث بھی ہے۔

حضرت ابن ابی اوفیؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ آپؐ نے ایک شخص سے فرمایا کہ ''اتر اور میرے لیے ستو گھول'' (تا کہ میں روزہ افطار کروں) اس شخص نے عرض کیا کہ ''یا رسول اللہؐ (ابھی تو) سورج (باقی معلوم ہوتا) ہے۔'' آپؐ نے (دوبارہ) فرمایا کہ ''اتر اور میرے لیے ستو گھول۔'' اس شخص نے (پھر) عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ (ابھی) سورج (باقی معلوم ہوتا) ہے۔'' آپؐ نے (تیسری دفعہ) فرمایا کہ ''اتر اور میرے لیے ستو گھول۔'' اس پر وہ شخص اترا اور اس نے آپؐ کے لیے ستو گھولے اور آپؐ نے پی لیے اور پھر اپنے ہاتھ سے اس طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ ''جب تم رات کو دیکھو کہ اس طرف سے بڑھ آئی ہے تو سمجھ لو کہ روزہ دار کے روزہ افطار کرنے کا وقت ہو گیا۔'' (بخاری)

سنن ابی داؤد میں بیان ہوا ہے کہ حضورؐ روزہ افطار کرتے وقت یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ صُمْتُ وَعَلٰی رِزْقِکَ اَفْطَرْتُ۔ (اے خدا میں نے تیرے ہی لیے روزہ رکھا اور تیرے ہی دیے ہوئے رزق سے افطار کرتا ہوں)

کتبِ احادیث سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حضورؐ کھجور یا پھر پانی سے روزہ افطار کرنا پسند فرماتے تھے۔

حضرت سلمانؓ بن عامر ضبی بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی روزہ افطار کرے تو اسے چاہیے کہ کھجور سے افطار کرے اور اگر کھجور نہ ملے تو پانی سے افطار کرے کیونکہ پانی انتہائی پاک ہے۔ (ترمذی)

روزے کی عمدگی کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ روزہ صرف خاص خاص خواہشات کو پورا نہ کرنے کا نام ہی نہیں بلکہ روزے کے دوران ان تمام ناپسندیدہ اور ناجائز امور سے خصوصی طور پر پرہیز لازمی ہے جنہیں خدا تعالیٰ نے ''گناہ'' قرار دیا ہے۔ لہٰذا روزہ رکھ کر جھوٹ، بدزبانی، غیبت، چغلی، لعنت زنی، طعن و تشنیع، دنگا فساد، دھوکا فریب، ریاکاری، بددیانتی، بدعملی وغیرہ تمام اعمالِ بد سے بچنا ضروری ہے اور روزہ سحری کھا کر رکھا جائے اور غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی کھول لیا جائے اور اس نیت سے رکھا جائے کہ خدا کے احکام کی اطاعت کر کے اس سے اجر حاصل کرنا ہے۔

روزے کی برکات

۱۔ ضبطِ نفس اور روح کی پاکیزگی: اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی میں طرح طرح کی خواہشات، جذبات اور میلانات رکھے ہوئے ہیں اور ان خواہشات، جذبات اور میلانات کو اگر بے لگام نہ ہونے دیا جائے تو یہ انسان کے لیے از حد مفید بلکہ ضروری ہیں۔ انسان کو بھوک لگتی ہے تو اسے کھانے کی خواہش ہوتی ہے، اسے پیاس لگتی ہے تو وہ کسی پی جانے والی شے کی تلاش میں ہوتا ہے۔ وہ تھک جاتا ہے تو اسے آرام کی خواہش ہوتی ہے۔ کوئی اس کی عزتِ نفس کو مشتعل کر دیتا ہے تو اسے غصہ آجاتا ہے۔ وہ ایک معاشرتی حیوان ہے، لہٰذا اسے ہم جنسوں کی صحبت پسند ہے۔ وہ اپنی فطرت کے تقاضے کے باعث خوبصورت چیزوں سے محبت کرتا ہے اور بدصورت چیزوں کو دیکھ کر اس کے دل میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے زندگی گزارنے کے لیے بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے وہ نفع کو پسند کرتا ہے اور نقصان سے ڈرتا ہے۔

اب ان سب اور انہیں جیسے دوسرے میلانات، خواہشات اور جذبات پر غور کریں تو پتہ چلے گا کہ انسانی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے یہ سب نہایت ضروری تھے۔ اگر کھانے کی خواہش پیدا نہ ہو تو انسان صرف صحت اور زندگی کو قائم رکھنے کے لیے کبھی اتنی تگ و دو نہ کر سکے جتنی وہ اب کرتا ہے اور نہ اتنی باقاعدگی سے جسم کو غذا بہم پہنچائے جیسے وہ اب کھانے پینے کی خواہش پیدا ہونے کے باعث پہنچاتا ہے اور جس کے پہنچانے کے

[illegible] اس کی صحت اور زندگی قائم رہتی ہے۔

اگر اسے آرام کی خواہش پیدا نہ ہو تو وہ کبھی اپنے جسم کے ساتھ اتنی رعایت نہ برتے کہ پابندی سے تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد اسے اس بات کا موقع دے کہ وہ آرام کر کے اپنی کھوئی ہوئی طاقت کو دوبارہ حاصل کر لے۔

اگر اس میں غصے کا جذبہ سرے سے موجود ہی نہ ہو' تو وہ ایک بے غیرت انسان بن کر رہ جائے جسے عزت اور ذلت کا کوئی احساس ہی نہ ہو۔

اگر اس میں ہم جنسوں سے ملنے ملانے اور ان کی صحبت حاصل کرنے کا میلان نہ ہوتا تو وہ کبھی ایک دوسرے کی زیادتی کو نظر انداز کرنے اور تمدن کی گاڑی کو مل جل کر چلانے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ لہٰذا انسانی معاشرہ اتنی منظم اور مفید شکل میں وجود میں نہ آتا' جیسے وہ اب ہے۔

اگر اس کے دل میں خوبصورت چیزوں کے لیے کشش نہ ہوتی تو انسانی تہذیب وہ آب و رنگ اور حسن اختیار نہ کر سکتی' جو وہ اب کیے ہوئے ہے۔

اور اگر وہ نفع پسند اور نقصان ناپسند واقع نہ ہوتا تو وہ خدا کی بخشی ہوئی عقلی اور دوسری صلاحیتوں سے بہت کم کام لیتا اور زندگی میں پیش آنے والی لازمی ضرورتوں کے لیے ضروری تگ و دو اور منصوبہ بندی بھی نہ کرتا' اور بے وجہ مصائب کا شکار رہتا۔

انہی مثالوں پر دوسرے جذبات' میلانات اور خواہشات کے فوائد کو بھی قیاس کر لیجیے۔ اس حکیم و دانا خالق نے اپنی اشرف المخلوقات مخلوق میں کوئی جذبہ' کوئی خواہش اور کوئی میلان ایسا نہیں رکھا جو بے ضرورت ہو۔

مگر اس کے ساتھ ہی تصویر کا دوسرا رخ دیکھنا بھی ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ خواہشات اور جذبات اپنی فطرت کے لحاظ سے بڑی طاقتور چیزیں ہیں اور ان کا طبعی میلان

اسی طرف ہوتا ہے کہ یہ حدِ اعتدال سے بڑھ جائیں اور جب یہ حدِ اعتدال سے بڑھ جاتے ہیں تو پھر یہ فائدے کے بجائے نقصان پہنچانا شروع کر دیتے ہیں۔

جس شخص کی کھانے پینے کی خواہش اعتدال سے زیادہ بڑھ جائے گی' وہ پیٹو اور فضول خرچ ہو جائے گا اور اس کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی پُرخوری اسے طرح طرح کے امراض کا شکار بنا دے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت سی بیماریاں صرف غذا کی بے اعتدالی ہی کے باعث پیدا ہوتی ہیں۔

ایسے ہی جو شخص ضرورت سے زیادہ آرام کا رسیا ہو جائے گا' وہ کاہل' نکما اور سست الوجود ہو کر رہے گا اور یہ کاہلی اور سست الوجودی اسے دنیا میں کسی کام کا نہیں رہنے دے گی۔

اسی طرح جن کے غصے کا جذبہ حدِ اعتدال سے زیادہ تیز ہو جائے گا' وہ بدخلق' تلخ کلام' جھگڑالو اور بدمزاج ہو جائیں گے اور ان کا غصیلا پن ان کے مخالفین سے زیادہ خود انہیں کو نقصان پہنچائے گا۔

ایسے ہی جن لوگوں کی مل بیٹھنے اور رونقِ محفل بننے کی خواہش اعتدال سے بڑھ جاتی ہے وہ زندگی کا بہت سا حصہ بے کار گپ بازی اور فضول بک بک میں ضائع کر دیتے ہیں۔

اسی طرح جن کا جذبہ حسن پسندی ضرورت سے زیادہ تیز ہو جائے گا وہ بے شمار ایسی نزاکتوں' نفاستوں' موشگافیوں اور بے کار اشغال میں وقت کھپانا شروع کر دیں گے' جن کی انسانی زندگی کو نہ کوئی حقیقی ضرورت ہے اور نہ انسانی زندگی جیسی مختصر سی مدت میں ان کے لیے وقت ہی نکالا جا سکتا ہے سوائے اس کے کہ انسان زیادہ مفید اور زیادہ ضروری کاموں کو نظر انداز کرنے کا نقصان مول لے۔ یہی نہیں بلکہ جن کی یہ حسِ حسن پرستی کچھ زیادہ ہی تیز ہو جاتی ہے۔ انہیں پھر اخلاق و شریعت کی حدود کو پائمال کرنے میں بھی باک

نہیں رہتا۔

ایسے ہی جن لوگوں کا جذبہ نفع پسندی ضرورت سے زیادہ بڑھ جاتا ہے وہ حرص اور لالچ کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہ حرص اور لالچ ان کے لیے بے ایمانیوں کے بہت سے دروازے کھول دیتے ہے۔ چوری، ڈاکہ، رشوت، غبن، جوابازی، سودخوری، ملک وملت سے غداری۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے کئی اور جرائم انسان کے حدِ اعتدال سے بڑھے ہوئے جذبہ نفع پسندی ہی کے باعث وجود میں آتے ہیں۔

تصویر کے ان دونوں رخوں پر غور کرنے کے بعد انسان پھر اسی نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اللہ رب العالمین نے انسان کو جو خواہشات، میلانات اور جذبات عطا کیے ہیں، وہ اپنی جگہ بہت مفید چیزیں ہیں، بشرطیکہ وہ اعتدال کی حد تک رہیں اور اعتدال سے آگے نہ بڑھیں۔ اعتدال کی حد تک تو وہ انسان کے لیے رحمت ہیں اور کامیاب زندگی گزارنے کے لیے اس کے ہمدرد ساتھی اور مددگار ثابت ہوتے ہیں مگر اعتدال کی حد سے آگے بڑھ جانے کے بعد یہی ہمدرد ساتھی بدخواہ اور دشمن بن جاتے ہیں اور انسان کی زندگی کو کامیاب بنانے میں امداد دینے کے بجائے اسے ناکامی اور تباہی کی طرف گھسیٹنا شروع کر دیتے ہیں۔

اب کون انسان کو بتائے کہ ہر خواہش اور ہر جذبے اور ہر میلان کی وہ حدِ اعتدال کہاں ہے جس پر پہنچ کر اسے رک جانا چاہیے اور جس سے آگے چلے جانے سے وہ خواہش، وہ میلان، وہ جذبہ انسان کے لیے آبِ حیات بننے کے بجائے زہرِ ہلاہل بن کر رہ جاتا ہے!

جذبات، میلانات اور خواہشات کی ان حدود کی پہچان کرانے والی شے وہ شریعتِ اسلامی ہے جسے خدا کے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے۔ یہ شریعت آپ کو کھول کھول کر بتاتی ہے کہ آپ ہر خواہش، ہر جذبے اور ہر میلان کے معاملے میں کس حد تک جائیں اور کس حد تک نہ جائیں۔ یہ شریعت اتنی تفصیلی ہے کہ اس نے زندگی

کا کوئی ضروری پہلو نظر انداز نہیں کیا۔

اس لیے جو شخص یہ خواہش رکھتا ہے کہ وہ اپنے جذبات' خواہشات اور میلانات سے پورا پورا فائدہ اٹھائے اور ان کے نقصانات سے بچ جائے۔ اس کے لیے اصلی کام یہی ہے کہ وہ اس شریعت کا علم حاصل کرے جس نے انسان کو فائدہ دینے والے اعمال اور نقصان پہنچانے والے افعال دونوں بتا دیے ہیں اور ان حدوں کا بھی تعین کر دیا ہے جہاں پہنچ کر انسان کے لیے رک جانا ضروری ہوتا ہے۔

لیکن یہاں ایک اور دقت انسان کی راہ میں کھڑی ہے اور وہ یہ ہے کہ بسا اوقات انسان کو یہ معلوم بھی ہوتا ہے کہ ہم اس حد کو پھلانگ رہے ہیں جسے پھلانگنے کے بعد نیکی برائی بن جائے گی مگر وہ کسی خواہش یا جذبے کی شدت کے ہاتھوں ایسا مجبور ہو جاتا ہے کہ برائی کو برائی جانتے ہوئے بھی اس کا ارتکاب کر گزرتا ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ غیبت کرنا صرف سخت گناہ ہی نہیں بلکہ خود ہمارے لیے از حد مضر اور نقصان دہ بھی ہے کیونکہ محنت کر کے اگر کوئی نیکی کمائی بھی ہے تو اب غیبت کرنے کے باعث وہ اس شخص کو مل جائے گی جس کی ہم غیبت کر رہے ہیں تاہم دل میں اس شخص کے خلاف نفرت کا جذبہ اتنا تیز ہوتا ہے یا ویسے ہی دوسرے کی مذمت کرنے کا ذوقِ فضول اتنا گہرا ہوتا ہے کہ غیبت کا نقصان جانتے ہوئے بھی غیبت کر گزرتے ہیں۔

ایک شراب خور جانتا ہے کہ شراب خوری اسے دنیا میں تباہی اور رسوائی اور آخرت میں عذاب کے سوا کچھ نہ دے گی' مگر وہ اپنی اس قبیح عادت کے ہاتھوں ایسا مجبور ہو جاتا ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی پیتا چلا جاتا ہے۔

ایک جوئے باز کو اچھی طرح معلوم ہے کہ جوا کھیلنا گناہ ہے اور تجربے نے اسے بتا بھی دیا ہے کہ جتنی امید اس کے جیت جانے کی ہے اتنا ہی خدشہ اس کے ہار جانے کا بھی

موجود ہے تاہم وہ ایک دم بہت سی دولت حاصل کر لینے کی حرص اسے ایسا بے بس کر دیتی ہے کہ وہ ہر خطرہ مول لے کر بھی داؤ پر داؤ لگائے چلا جاتا ہے۔

اب ایسی صورتوں میں انسان کیا کرے؟--- جس کو معلوم نہ ہو کہ نیکی کیا ہے اور برائی کیا' اسے تو انسان یہ مشورہ دے کہ تم نیکی اور برائی کی پہچان پیدا کرو' مگر جہاں معلوم ہی ہو کہ جن اعمال کا ارتکاب کر رہا ہوں' وہ برائیاں ہیں اور اس کے باوجود انہیں کیا جا رہا ہو وہاں انسان کیا مشورہ دے؟

حقیقت یہ ہے کہ بہت سے گناہ ایسے بھی کیے جاتے ہیں جن کا ارتکاب کرنے والے دل سے انہیں گناہ مانتے ہیں مگر وہ اپنی حدِ اعتدال سے بڑھی ہوئی خواہشات اور جذبات کے ہاتھوں میں ایسے بے بس کھلونے بن چکے ہوتے ہیں کہ برائیوں کو برائیاں جانتے ہوئے اور ان سے بچنے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی ان کا ارتکاب کیے چلے جاتے ہیں۔

جب صورت یہ ہو تو پھر کیا کیا جائے کہ انسان اتنی قوت اور طاقت کا مالک بن جائے کہ وہ اپنی خواہشات اور جذبات کو مجبور کر سکے کہ وہ اعتدال کی حدود سے آگے نہ جائیں یا اگر جا چکے ہیں تو واپس آجائیں اور برائیوں کے بجائے نیکیوں کا ذریعہ بن کر رہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کام ایک مضبوط قوتِ ارادی کا ہے' جو لوگ اچھائی سے واقف ہوتے ہیں' اچھائی اختیار کرنا چاہتے ہیں مگر پھر بھی اختیار نہیں کر سکتے' ان کی قوتِ ارادی درحقیقت اتنی کمزور ہوتی ہے کہ وہ ان کی خواہشات اور جذبات کو قابو میں نہیں لا سکتی اور خواہشات و جذبات منہ زور ہو کر جس طرف چاہتے ہیں اسے بہا لے جاتے ہیں۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ انسانی جذبات و خواہشات درحقیقت مفید

چیزیں ہیں مگر اسی صورت میں جب انسان کی قوتِ ارادی اتنی مضبوط ہو کہ وہ انہیں حدِ اعتدال سے آگے نہ بڑھنے دے--- گویا انسان کے ہدایت کی راہ پر چلنے میں اس کی قوت ارادی بڑا اہم حصہ ادا کرتی ہے۔

اب آپ غور کیجئے کہ روزہ کس طرح انسان کی قوتِ ارادی کو مضبوطی بخشتا ہے اور اس کے جذبات وخواہشات کی قوت کو کم کر کے انہیں راہِ اعتدال پر لاتا ہے۔

روزہ رکھ کر انسان کو بھوک لگتی ہے اور وہ کچھ کھانا چاہتا ہے مگر روزہ اسے اجازت نہیں دیتا کہ اس خواہش کو پورا کر لے۔ لہٰذا وہ اپنی اس خواہش کو رد کر دیتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کمزور ہو کر دب جاتی ہے۔ روزے کے دوران کم ہی کبھی ایسے ہوتا ہے کہ ایک دفعہ بھوک لگے اور پھر شام تک لگے ہی چلی جائے، بلکہ کچھ دیر اس کا احساس رہتا ہے اور پھر جب اسے پورا نہیں کیا جاتا تو وہ گویا مایوس ہو کر دب جاتی ہے اور اس کا احساس بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اب یہ عین ممکن ہے کہ افطار تک کھانے کی یہ خواہش پھر کئی دفعہ اپنا احساس دلائے مگر ہر بار یہی ہوگا کہ جب اسے پورا نہیں کیا جائے گا تو وہ دب جائے گی۔ رمضان کے دوران کئی دن تک یونہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب انسان کافی روزے رکھ لیتا ہے تو پھر ایسی سٹیج بھی آجاتی ہے کہ روزے کے دوران یا تو بھوک بالکل لگتی ہی نہیں یا اس کا احساس آگے سے بہت کمزور ہو جاتا ہے۔

یہی صورت دوسری خواہشات کی ہوتی ہے کہ روزے کے باعث جب انہیں پورا نہیں کیا جاتا تو کچھ دیر اپنا احساس دلا کر پھر وہ دب جاتی ہیں اور زیادہ روزے رکھ لینے کے بعد پھر ان کا احساس بھی بہت کمزور ہو جاتا ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ خواہشات کی یہ خصوصیت ہے کہ جب ہم انہیں پورا کرتے چلے جائیں تو یہ مضبوط ہوتی جاتی ہیں اور جب انہیں دباتے جائیں تو یہ کمزور پڑتی جاتی ہیں۔

یہی حال قوتِ ارادی کا ہے جتنی اس کی زیادہ مشق ہوگی یہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائے گی اور اگر اس سے کام نہ لیا گیا تو کمزور پڑتی چلی جائے گی۔ اب روزے کے دوران چونکہ انسان اپنی قوتِ ارادی کو حرکت دے کر کئی خواہشات کو بار بار دباتا ہے اس لیے یہ قوت بار بار حرکت میں آتے رہنے کے باعث مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جاتی ہے اور انسان کی خواہشات بار بار دبائے جانے کے باعث کمزور پڑتی جاتی ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اس قابل ہو جاتا ہے کہ اپنی خواہشات و جذبات کو قابو میں لا کر انہیں حدِ اعتدال کے اندر رہنے پر مجبور کیے رکھے اور جب خواہشات و جذبات حد اعتدال کے اندر رہیں گے تو انسان خود بخود ہی گناہوں سے بچ جائے گا۔ کیونکہ گناہ تو انسانی خواہشات کے حدِ اعتدال سے بڑھ جانے ہی کے باعث وجود میں آتے ہیں۔ روزہ انہیں اعتدال پر رکھ کر گناہوں کی کمی کا باعث بنتا ہے۔

مضبوط قوتِ ارادی کے ذریعے خواہشات و جذبات کو قابو میں کر لینے ہی کا دوسرا نام ضبطِ نفس ہے اور یہ ضبطِ نفس انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ پرہیزگاری کی زندگی گزار سکے۔ یہی مفہوم ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا۔

> ''اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جیسے کہ ان پر فرض کیے گئے تھے جو تم سے پہلے ہوئے۔ اس سے توقع ہے کہ تم میں پرہیز گاری کی صفت پیدا ہوگی۔''

اس پر ایک سوال یہ بھی اٹھایا جاتا ہے کہ بعض لوگ روزہ رکھنے کے عادی ہوتے ہیں مگر ان میں پرہیزگاری نظر نہیں آتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لوگ پھر اسی قسم کا روزہ رکھتے ہوں گے جس کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا تھا:

> ''جس نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا ہی نہ چھوڑا تو خدا کو اس

بات کی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔" (بخاری)

روزوں کے نظام کا فطری خاصہ تو یہی ہے کہ روزہ رکھنے سے پرہیزگاری پیدا ہوتی ہے مگر یہ نتیجہ پورے طور پر اسی صورت میں نکلتا ہے کہ روزہ رکھنے کے تمام تقاضے پورے کیے جائیں۔ روزہ فی الحقیقت اس شے کا نام ہے کہ ایک خاص وقت سے لے کر دوسرے خاص وقت تک کچھ معین خواہشات کو بالکل پورا نہ کیا جائے اور تمام اقسام کے گناہوں سے خصوصی طور پر پرہیز کرنے کی کوشش جاری رہے۔ اب جو شخص نہ کھانے اور نہ پینے ہی کو روزہ سمجھ لے اور روزے سے تعلق رکھنے والی باقی سب ہدایات سے بے نیاز رہے، اس کی قوتِ ارادی آخر مضبوطی کی اس حد تک کیسے پہنچ سکتی ہے کہ اسے اس کے جذبات و خواہشات پر حکمران بنا دے۔ لہٰذا اس کے پرہیزگار بننے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

اب رہی یہ بات کہ روزہ رکھنے سے روح پاک ہوتی ہے تو اس کا تجربہ ہر اس انسان کو ہو جاتا ہے جو روزے کی ان تمام پابندیوں کے ساتھ روزہ رکھے جو خدا اور خدا کے رسولؐ نے بتائی ہیں۔ اللہ کی راہ میں بھوک پیاس اور دوسری خواہشات کو دبانے کی تکلیف اٹھانے کے باعث دل و دماغ کی کیفیت کچھ ایسے بدل جاتی ہے کہ ان میں اچھے خیالات ہی آتے ہیں اور برے خیالات جیسے سر اٹھانے سے شرمانے لگتے ہیں۔ پورا مہینہ روزانہ اس شے کی مشق ہوتے رہنے کے باعث روح کی بہت سی کثافتیں دھل جاتی ہیں اور انسان برے اعمال سے بچنے اور نیک اعمال اختیار کرنے کے لیے زیادہ مستعد ہو جاتا ہے۔

یہ جو حضورؐ نے ہر ماہ تین نفلی روزے رکھنے کو پسند فرمایا ہے۔ اس سے بھی یہی مقصود ہے کہ نفس پر قابو پانے کی جو تربیت انسان رمضان کا پورا مہینہ لیتا رہتا ہے اس کی مشق باقی گیارہ مہینوں میں بھی گاہے گاہے ہوتی رہے تاکہ انسان کو اپنے نفس پر مستقل طور پر قابو حاصل رہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''روزے ڈھال ہیں۔'' (مسلم)

ڈھال پرانے زمانے کا ایک جنگی ہتھیار تھا جسے تلوار کے واروں سے بچنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ روزوں کے ڈھال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہر وقت شیطان کے واروں کی زد پر ہے جو ہمیشہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ اسے کسی نہ کسی طرح ورغلا کر گناہوں کی طرف گھسیٹ لے چلے۔ جس سے بالآخر وہ خدا کے غضب کا مستحق ٹھہرے۔ اب جو شخص خدا اور خدا کے رسولؐ کی ہدایات کے مطابق روزے رکھے گا' اس کا ایمان اور قوتِ ارادی اتنی مضبوط ہو جائے گی کہ اس پر شیطان کے ورغلانے کا اثر نہیں ہو گا۔ اور جب وہ شیطان کے بہکانے میں آئے گا ہی نہیں تو پھر وہ خدا کے غضب سے بھی بچ جائے گا۔ گویا روزے ایسی ڈھال ہیں جو اسے شیطان کے بہکانے اور خدا کے غضب دونوں چیزوں سے بچاتے ہیں۔

واضح رہے کہ روزہ ایک طرف تو گناہوں سے بچاؤ کا ذریعہ ہے اور دوسری طرف یہ کئی گناہوں کا کفارہ بھی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص قسم کھا کر توڑ دے تو کفارہ یہ ہے کہ وہ دس مسکینوں کو کھانا کھلائے یا دس مسکینوں کو کپڑے پہنائے یا ایک غلام آزاد کرے اور اگر ایسا کرنے کی سکت نہ ہو تو پھر تین دن کے روزے رکھے۔

ایسے ہی حج کے دوران شکار کرنے کی ممانعت ہے۔ اب جو شخص حج کے دوران شکار کرنے کی غلطی کا ارتکاب کرے اور اس میں اتنی مالی سکت نہ ہو کہ قربانی دے سکے یا چند مسکینوں کو کھانا کھلا سکے تو پھر اس کا کفارہ بھی یہی ہے کہ جتنے مسکینوں کو کھانا کھلانا تھا اتنے روزے رکھ لے۔

ایسے ہی اگر کوئی مسلمان غلطی سے کسی اور مسلمان کو قتل کر دے تو اگر مقتول

مسلمان کا تعلق اسلامی علاقے سے ہوگا یا کسی ایسے علاقے سے جس کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدہ ہوگا تو پھر قاتل کے لیے ضروری ہے کہ مقتول کے وارثوں کو خون بہا دے اور ایک غلام آزاد کرے اور اگر غلام نہ پائے تو پے در پے دو مہینوں کے روزے رکھے' اس طرح کہ ان میں ناغہ نہ ہونے پائے۔

سید سلیمان ندوی روزے کی برکات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''روزے کی بھوک اور فاقہ ہمارے گرم و مشتعل قویٰ کو تھوڑی دیر کے لیے سرد کر دیتا ہے۔ کھانے اور پینے کی مصروفیت سے ہم آزاد ہوتے ہیں۔ دوسرے سخت کاموں سے بھی ہم اس وقت پرہیز کرتے ہیں۔ دل و دماغ' شکم سیر معدے کے فاسد بخارات' کی پریشانی سے محفوظ ہوتے ہیں۔ ہمارے اندرونی جذبات میں ایک قسم کا سکون ہوتا ہے۔ یہ فرصت کی گھڑیاں' یہ قویٰ کے اعتدال کی کیفیت' یہ دل و دماغ کی جمعیت خاطر' یہ جذبات کا سکون' ہمارے غور و فکر' اپنے اعمال کے محاسبے' اپنے کاموں کے انجام پر نظر اور اپنے کیے پر ندامت اور پشیمانی اور خدا تعالیٰ کی باز پرس سے ڈر کے لیے بالکل موزوں ہے اور گناہوں سے توبہ اور ندامت کے احساس کے لیے یہ فطری اور طبعی ماحول پیدا کر دیتا ہے اور نیکی اور نیک کاموں کے لیے ہمارے وجدانی ذوق و شوق کو ابھارتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ رمضان کا زمانہ تمام عبادتوں اور نیکیوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ اس میں تراویح ہے' اس میں اعتکاف رکھا گیا ہے۔ اس میں زکوٰۃ نکالنا مستحب ہے اور خیرات کرنا سب سے بہتر ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فیاضی تو گو سدا بہار تھی لیکن رمضان کے موسم میں وہ تیز ہواؤں سے بھی زیادہ ہو جاتی تھی۔'' (سیرۃ النبیؐ جلد پنجم)

۲۔ **نیکی کا اجتماعی ماحول:** روزہ رکھنے کی مندرجہ بالا برکت تو وہ ہے کہ اگر لوگ فرداً فرداً اپنی اپنی مرضی کے مہینوں میں بھی روزے رکھیں تو یہ فوائد تو حاصل ہو ہی جائیں گے مگر

اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی بلکہ سب مسلمانوں کے لیے ایک مہینہ مخصوص کر دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ اس خاص مہینے ہی میں مل جل کر روزے رکھیں۔ اس فرمان نے روزے کو ایک انفرادی نیکی کے درجے سے اٹھا کر ایک اجتماعی نیکی کے رتبے پر پہنچا دیا ہے اور اس سے قدرتی طور پر اس کے فوائد بھی کئی گنا بڑھ گئے ہیں۔ رمضان کے مہینے کے مخصوص ہو جانے کے باعث ایک طرف تو اسلامی معاشرے میں پرہیزگاری کی ایک ایسی فضا قائم ہو جاتی ہے جس میں روزہ داروں کے لیے روزے رکھنے زیادہ آسان ہوتے ہیں اور دوسری طرف روزوں کے نظام نے مسلمان افراد اور مسلم معاشرے کو جو فوائد پہنچانے ہوتے ہیں وہ بدرجہا زیادہ ہو جاتے ہیں۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی رمضان کے مہینے کے روزوں کے لیے مخصوص ہو جانے کے فوائد کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''اجتماعی عمل کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ اس سے ایک خاص قسم کی نفسیاتی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک شخص انفرادی طور پر کسی ذہنی کیفیت کے تحت کوئی کام کر رہا ہو اور اس کے گرد و پیش دوسرے لوگوں میں نہ وہ ذہنی کیفیت ہو اور نہ وہ اس کام میں اس کے شریک ہوں، تو وہ اپنے آپ کو اس ماحول میں بالکل اجنبی پائے گا۔ اس کی کیفیت ذہنی صرف اسی کی ذات تک محدود اور صرف اسی کی نفسی قوتوں پر منحصر رہے گی۔ اس کو نشوونما پانے کے لیے ماحول سے کوئی مدد نہ ملے گی، بلکہ ماحول کے مختلف اثرات اس کیفیت کو بڑھانے کے بجائے الٹا گھٹا دیں گے۔

لیکن اگر وہی کیفیت پورے ماحول پر طاری ہو۔ اگر تمام لوگ ایک ہی خیال اور ایک ہی ذہنیت کے ماتحت ایک ہی عمل کر رہے ہوں تو معاملہ برعکس ہوگا۔ اس وقت ایک ایسی اجتماعی فضا بن جائے گی جس میں پوری جماعت پر وہی ایک کیفیت چھائی ہوئی ہوگی

اور ہر فرد کی اندرونی کیفیت ماحول کی خارجی اعانت سے غذا لے کر بے حد و حساب بڑھتی چلی جائے گی..... اجتماعی روزے کا مہینہ قرار دے کر رمضان سے شارعؑ نے یہی کام لیا ہے۔ جس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ ہر غلہ اپنا موسم آنے پر خوب پھلتا پھولتا ہے اور ہر طرف کھیتوں پر چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی طرح رمضان کا مہینہ گویا خیر و صلاح اور تقویٰ و طہارت کا موسم ہے۔ جس میں برائیاں دبتی ہیں۔ نیکیاں پھلتی ہیں' پوری پوری آبادیوں پر خوفِ خدا اور حبِ خیر کی روح چھا جاتی ہے اور ہر طرف پرہیزگاری کی کھیتی سرسبز نظر آنے لگتی ہے۔

اس زمانے میں گناہ کرتے ہوئے آدمی کو شرم آتی ہے۔ ہر شخص خود گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے کسی دوسرے بھائی کو گناہ کرتے دیکھ کر اسے شرم دلاتا ہے۔ ہر ایک کے دل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ کچھ بھلائی کا کام کرے۔ کسی غریب کو کھانا کھلائے' کسی ننگے کو کپڑے پہنائے' کسی مصیبت زدہ کی مدد کرے' کہیں کوئی نیک کام ہو رہا ہو تو اس میں حصہ لے' کہیں کوئی بدی ہو رہی ہو تو اسے روکے' اس وقت لوگوں کے دل نرم ہو جاتے ہیں' ظلم سے ہاتھ رک جاتے ہیں' برائی سے نفرت اور بھلائی سے رغبت پیدا ہو جاتی ہے' توبہ اور خشیت و انابت کی طرف طبیعتیں مائل ہوتی ہیں' نیک بہت نیک ہو جاتے ہیں اور بد کی بدی اگر نیکی میں تبدیل نہیں ہوتی تب بھی اس جلاب سے اس کا اچھا خاصا تنقیہ ضرور ہو جاتا ہے۔ غرض اس زبردست حکیمانہ تدبیر سے شارعؑ نے ایسا انتظام کر دیا ہے کہ ہر سال ایک مہینے کے لیے پوری اسلامی آبادی کی صفائی ہوتی رہے' اس کو اوور ہال کیا جاتا رہے۔ اس کی کایا پلٹی جائے اور اس میں مجموعی حیثیت سے روح اسلامی کو از سرِ نو زندہ کر دیا جائے۔" (اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر)

حضرت شاہ ولی اللہؒ کا فرمان ہے:

"مسلمانوں کے مختلف طبقوں اور مختلف جماعتوں کا ایک وقت میں ایک چیز پر اجماع اور اجتماع جس میں سب ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں' روزے کو ان کے لیے آسان بنا دیتا ہے اور اِس سے اُن کی بہت ہمت افزائی ہوتی ہے۔" (حجۃ اللہ البالغہ)

نیکی کی اس اجتماعی فضا کا ایک خاص اثر جو اہل اسلام پر پڑتا ہے' ان میں جماعتی احساس کا پیدا ہونا ہے۔ جب معاشرے میں ہر طرف لوگ ایک ہی جیسے اعمال و افعال میں مصروف ہوتے ہیں تو غیر ارادی طور پر ان میں یہ احساس گہرا ہوتا جاتا ہے کہ ہم سب ایک ہیں۔ فضا کی پاکیزگی کے سلسلے میں ایک اور شے جس کا احساس دلایا جاتا ہے' یہ ہے کہ رمضان کے دوران اگر کسی شخص نے کسی جائز عذر کی بناء پر روزہ نہ بھی رکھا ہو تو بھی اس کے لیے مناسب نہیں کہ وہ برسرِ عام کھاتا پیتا پھرے اور اس طرح رمضان کی فضا کے تقدس کی بے حرمتی کا مرتکب ہو۔ جس نے روزہ نہیں رکھا ظاہر ہے وہ کھائے پیئے گا ہی' مگر یہ کیوں ضروری ہے کہ وہ ڈٹ کر سب کے سامنے ہی کھائے۔ دیکھنے والوں سبھی کو تو معلوم نہیں کہ اس کے پاس روزہ نہ رکھنے کے لیے کوئی جائز عذر موجود ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ یہ سمجھیں کہ اس نے بے وجہ روزہ چھوڑ رکھا ہے اور پھر اس کی دیکھا دیکھی کئی دوسرے کمزور ایمان والے بھی روزہ چھوڑنے پر دلیر ہو جائیں۔

ایسے ہی جو لوگ بلا عذر روزہ چھوڑ دیتے ہیں اور پھر ڈھٹائی سے سب کے سامنے کھاتے پیتے بھی رہتے ہیں' انہیں بھی خدا سے ڈرنا چاہیے کہ ایک گناہ تو روزہ چھوڑ کر کیا ہے اور اب دوسرا لوگوں کے لیے علانیہ بری مثال بن کر کر رہے ہیں۔

صبر اور سخت کوشی: روزہ رکھنے کی تیسری برکت یہ ہے کہ روزے کا پابند انسان عموماً صابر اور سخت کوش ہو جاتا ہے اور اس دنیا میں کامیاب زندگی گزارنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان اس قابل ہو کہ زندگی کی راہ میں آنے والی سختی اور نرمی کا مقابلہ صبر و استقلال

اور ہمت و جرأت سے کر سکے۔ روزے رکھتے رہنے کے باعث انسان کو بھوک پیاس برداشت کرنے، رات کو دیر تک جاگنے، پچھلے پہر اٹھ کھڑے ہونے اور خالی معدہ سے روزمرہ کے کام کرتے رہنے کی مشق ہوتی رہتی ہے۔ روزہ رکھ کر لوگ آرام سے پلنگوں پر تو نہیں لیٹ جاتے۔ رمضان کے دوران بھی مرد لوگ اپنی روزی کمانے کے کاموں میں اور عورتیں اپنی گھریلو ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں بدستور مصروف رہتی ہیں اور عام حالات میں جو انسان چند گھنٹوں کی محنت کے بعد کچھ تھوڑا بہت کھا پی کر اپنے آپ کو تازہ دم کر لیتا ہے، اس کا بھی امکان نہیں ہوتا، لہٰذا روزہ داروں کو سخت کوشی کی اچھی عادت ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگوں سے توقع ہے کہ وہ زندگی کی سختیوں کو بے روز لوگوں کی نسبت زیادہ ہمت و استقلال اور خندہ پیشانی سے برداشت کر لیں گے۔ روزے کا پابند سپاہی اگر کبھی ایسے حالات میں گھر جائے کہ بغیر کھائے پیے اسے ملک کا دفاع کرنا پڑے تو امید ہے کہ وہ زیادہ بہتر طریقے سے اس فریضے کو انجام دے گا۔ کیونکہ اسے تو پہلے ہی اس بات کی مشق ہے کہ خالی معدہ فرائض کو سرانجام دینا ہے۔

اسلام نے جس طرزِ زندگی کو پسند فرمایا ہے، اس کا کاہلی، سستی، آرام طلبی، عیش پسندی اور تن آسانی سے کوئی جوڑ نہیں بلکہ وہ تو چستی، ہوشیاری، محنت و مشقت اور سخت کوشی کا مطالبہ کرتی ہے۔ ایک کاہل اور سست الوجود انسان کے لیے کیسے ممکن ہے کہ دن میں پانچ مرتبہ اہتمام کر کے اٹھے اور وضو کر کے نماز ادا کرے۔

ایک آرام طلب اور تن آسان شخص کا ہے کے لیے سفر کی مشقتیں برداشت کر کے حج کرنے جائے گا۔

ایک عیش پسند کیوں بزمِ عیش و طرب سے منہ موڑ کر میدانِ جہاد کا رخ کرے گا۔

جس کی محنت و مشقت سے جان جاتی ہوگی اس سے کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اہلِ خانہ کی خدمت کرے گا' ہمسائے کی امداد کو پہنچے گا' بیمار کی تیمارداری کرے گا' نابینا کا ہاتھ پکڑ کر اسے منزل تک پہنچائے گا اور کمزور کا بوجھ بٹائے گا۔

اللہ کے حقوق ادا کرنے ہوں یا اس کے بندوں کے' ہمت و استقلال' اور محنت و مشقت کی تو ہر جگہ ضرورت ہوتی ہے اور رمضان کے روزے انسان کو دوسرے فوائد پہنچانے کے علاوہ اسے محنت و مشقت اور سخت کوشی کا عادی بھی بناتے ہیں۔

۴۔ جذبہ امدادِ باہمی: روزہ رکھنے کا ایک اور روشن پہلو یہ ہے کہ اس سے خوشحال لوگوں کو اپنے غریب اور تنگ دست بہن بھائیوں کی تکلیف کا احساس ہو جاتا ہے جنہیں خدا نے اتنا دے رکھا ہے کہ جب بھی انہیں بھوک لگتی ہے وہ سیر ہو کر کھا سکتے ہیں۔ انہیں کیسے پتہ چل سکتا ہے کہ جن لوگوں کو بھوک لگنے پر کھانے کو کچھ نہیں ملتا وہ کس قسم کی اذیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ ہوتے سا تے تو کوئی بھی اپنے آپ کو بھوک سہنے کی تکلیف میں مبتلا نہیں کرتا' اس لیے اگر روزے نہ ہوتے تو خوشحال لوگوں کو کبھی بھی پتہ نہ چل سکتا کہ جن مفلوک الحال لوگوں کو کھانے کو نہیں ملتا' ان پر کیا بیتتی ہے۔ روزے کی پابندی بڑے بڑے لکھ پتی' کروڑ پتی بلکہ ارب پتی لوگوں کو بھی اچھی طرح احساس دلا دیتی ہے کہ جب انتڑیاں بھوک سے سوکھ رہی ہوں اور پیاس نے جان پر بنا رکھی ہو تو پھر کس اذیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اب اگر کسی انسان کے دل میں اپنے ابنائے جنس کا ذرا سا بھی درد موجود ہے تو خود تکلیف میں مبتلا ہو کر اسے ان لوگوں سے ضرور ہمدردی پیدا ہوگی جو آئے دن اس تکلیف سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن جو شخص کبھی اس تکلیف سے دوچار ہوا ہی نہ ہو وہ فاقہ مستوں کے دکھ کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔ لہٰذا روزے کو فرض قرار دے کر اللہ تعالیٰ نے یہ بندوبست فرما دیا ہے کہ تنگدست ہی نہیں بلکہ خوشحال کو بھی پتہ چل جائے کہ بھوک پیاس کی

تکلیف کیسی ہوتی ہے۔

حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں: ''کسی کا سوزِ جگر سمجھنے سے پہلے خود سوختہ جگر ہونا ضروری ہے۔''

روزوں کا نظام ہر تنگدست اور ہر خوشحال کو سوزِ جگر بخش کر اس بات پر ابھارتا ہے کہ وہ معاشرے کے سوختہ جگر لوگوں کے جگر کو ٹھنڈا کرنے کا اہتمام کرتے رہیں۔

۵۔ خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا احساس: روزہ رکھنے کی ایک خاص برکت یہ بھی ہے کہ اس سے خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا احساس زیادہ پختہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اگر انسان کو خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا پختہ احساس نہ ہو تو وہ روزے کو کبھی پابندی سے نہ نبھا سکے۔

پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ روزہ ایک ایسی عبادت ہے جو ریا سے بالا ہے۔ کیونکہ اگر وہ لوگوں کو دکھانے کی خاطر رکھا جائے تو لوگ ہر وقت تو روزہ دار کے ساتھ نہیں لگے رہتے۔ وہ ان کے سامنے روزے سے رہ کر تنہائی میں کھا پی بھی سکتا ہے۔ مگر جب وہ بھوک پیاس کی انتہائی سختی سہہ کر بھی کھانے پینے سے پرہیز ہی کرتا ہے اور تنہائی میں بھی کوئی شے نہیں چکھتا تو پھر یہ واضح ہے کہ وہ خدا ہی کے لیے روزہ رکھ رہا ہے اور اسے پکا قلبی یقین ہے کہ خدا ہر وقت اس کے ساتھ ہے اور ہمہ وقت اسے دیکھ رہا ہے۔ اگرچہ روزے کے دوران ہر وقت شعوری طور پر یہ احساس نہیں ہوتا کہ خدا ہمیں دیکھ رہا ہے مگر غیر شعوری طور پر یہ ہمہ وقت موجود ہوتا ہے اور نظر نہ آنے والے خالق کی خاطر سختی برداشت کرتے رہنے کے باعث یہ غیر شعوری طور پر ہی پختہ سے پختہ تر بھی ہوتا جاتا ہے۔

بعض دوسرے فوائد: واضح رہے کہ روزہ رکھنا ایک ''عبادت'' ہے اور اسے رکھتے

ہوئے صرف خدا کی خوشنودی ہی مقصود ہونی چاہیے' کوئی غرض پیشِ نظر رکھنا نہایت غلط بات ہے۔ ہاں البتہ اگر یہ واضح کرنے کے لیے کہ اسلام نے انسان کو ایسا نظامِ زندگی دیا ہے جس سے آخرت اور دنیا دونوں کے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ روزے کے مادی فوائد سے بھی واقف کرایا جائے تو حرج نہیں۔

روزہ روح کو پاکیزگی عطا کرنے کے علاوہ جسمانی صحت کو بھی بہت فائدہ پہنچاتا ہے۔ سال میں ایک مرتبہ معدے کو معین وقفوں کے لیے آرام دیتے رہنا صحت پر بہت اچھا اثر ڈالتا ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی روزے کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

''سب جانتے ہیں کہ روزہ صحت کے لیے بھی مفید ہے اور خالص طبی نقطہ نظر سے بھی ہر شخص کے لیے مناسب اور بہتر ہے کہ وہ سال میں کچھ دن ضرور روزہ رکھے۔ اس لیے کہ زیادہ کھانے پینے اور ہر وقت انواع واقسام کے کھانوں کی فکر میں مبتلا رہنے کا نتیجہ یہ ہے کہ طرح طرح کے جسمانی اور اخلاقی عوارض پیدا ہو گئے ہیں اور تقریباً ہر شخص ان سے عاجز اور پریشان ہے اور یہ ماننے کے لیے مجبور ہے کہ طب اور صحت کے نقطۂ نظر سے بھی روزہ کے بہت فوائد ہیں۔'' (ارکان اربعہ)

انسانی زندگی کا ایک اہم مسئلہ وقت کی کمی بھی ہے۔ بسا اوقات انسان کوئی اچھا کام کرنے کا شوقین بھی ہوتا ہے اور اس میں اسے کرنے کی صلاحیت بھی موجود ہوتی ہے مگر زندگی میں وقت نہ ملنے کے باعث وہ اسے نہیں کر سکتا۔ روزے کا ایک افادی پہلو یہ بھی ہے کہ یہ انسان کو بہتر کام کرنے کے لیے کچھ فرصت مہیا کر دیتا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی روزے کے اس پہلو پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''انسان اگر اپنے دن رات کے اشغال اور مصروفیتوں پر غور کرے تو اسے معلوم

ہوگا کہ اس کے وقت کا ایک اچھا خاصا حصہ محض کھانے پینے اور اس کے اہتمام میں صرف ہو جاتا ہے۔ اگر انسان ایک وقت کا کھانا پینا کم کر دے تو اس کے وقت کا بڑا حصہ بچ جائے۔ یہ وقت خدا کی عبادت اور مخلوق کی خدمت میں صرف کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہمیشہ نہیں تو کم از کم سال میں ایک دفعہ تو اس غیر ضروری ضرورت کو کم کر کے یہ سعادت حاصل کی جائے۔"

(سیرۃ النبیؐ جلد پنجم)

غرضکہ روزہ انسان کے نفس کے اندر وہ قوتیں اور صلاحیتیں پیدا کرتا ہے جو اسے اس بڑی عبادت کے لیے تیار کرتی ہیں، جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا تھا۔ یعنی ہر معاملے میں خدا کی خوشنودی کو پیش نظر رکھنا۔

تلاوت کی فضیلت

رمضان اور قرآن پاک کا آپس میں جو گہرا تعلق ہے' وہ محتاجِ بیان نہیں۔ کلام پاک میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ۔ (البقرہ:۱۸۵)

''رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔''

لہٰذا یہ قدرتی بات ہے کہ اس مبارک مہینے میں تلاوتِ قرآن خصوصی طور پر زیادہ کی جائے۔ وہ حدیث بھی بیان کی جا چکی جس سے پتہ چلتا ہے کہ رمضان کے دوران ہر رات حضرت جبرئیلؑ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتے تھے اور حضورؐ انہیں قرآن سناتے تھے۔ حضورؐ کے فرمان کے مطابق قرآن کے ہر حرف کو پڑھنے سے دس نیکیاں ملتی ہیں اور رمضان کے دوران ہر نیکی کا ثواب کئی گنا بڑھ جاتا ہے تو اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رمضان کے دوران تلاوت کرنے کا اجر و ثواب کتنا زیادہ ہوتا ہوگا۔ لہٰذا ہر مومن کی یہ طبعی خواہش ہونی چاہیے کہ رمضان کے دوران زیادہ سے زیادہ تلاوت کرے۔ ذیل کی احادیث سے تلاوت کی تاکید اور فضیلت واضح ہونے کے علاوہ یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ کن خاص خاص سورتوں اور خاص خاص آیات کو خصوصی فضیلت حاصل ہے۔

حضرت ابو موسیٰؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''قرآن کریم کا خیال رکھو۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی

جان ہے کہ جتنی جلدی اونٹ اپنا بندھن توڑ کر بھاگتا ہے اس سے زیادہ جلدی قرآن (ذہن سے نکل) بھاگتا ہے۔" (مسلم)

حضرت ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "قرآن کی مثال اس اونٹ کی سی ہے جس کا گھٹنا بندھا ہوا ہو کہ اگر اس کا مالک اسے باندھے رکھے تو وہ رکا رہتا ہے اور اگر اس کی رسی کھول دے تو وہ چلا جاتا ہے۔" (ابن ماجہ)

اس بات کو بیان کرنے سے حضورؐ کی مراد یہ ذہن نشین کرنا تھا کہ تلاوت قرآن کی جاتی رہنی چاہیئے کیونکہ اگر انسان تلاوت کرتا رہے تو قرآن یاد رہتا ہے اور اگر تلاوت سے غفلت برتی جائے تو قرآن بہت جلد بھول جاتا ہے۔ یہ مضمون حضورؐ کے کئی اقوال میں بیان ہوا ہے۔ صحیح بخاری میں بیان ہوا ہے کہ ایک دن رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خواب دیکھا جس میں آپؐ کو مختلف گناہوں کی سزائیں دکھائی گئیں۔ اس دوران میں آپؐ نے ایک ایسے شخص کو دیکھا جو چت لیٹا ہوا تھا اور ایک دوسرا شخص ہاتھ میں ایک پتھر لیے اس کے سرہانے کھڑا تھا۔ وہ اس پتھر سے اس لیٹے ہوئے شخص کا سر توڑتا تھا۔ جب وہ اس کے سر پر پتھر مارتا تو پتھر لڑھک کر دور چلا جاتا۔ وہ مارنے والا آدمی اس پتھر کو لینے جاتا تو اس کے آنے تک اس لیٹے ہوئے شخص کا سر جڑ کر پھر پہلے جیسا ہو جاتا اور وہ مارنے والا پھر آ کر اسے پتھر مارتا اور اس کا سر توڑتا۔ بس اسی طرح اس کا سر بار بار توڑا جاتا اور بار بار وہ سر جڑ جاتا اور پھر اسے توڑا جاتا۔ حضورؐ کے پوچھنے پر آپؐ کو بتایا گیا کہ یہ وہ شخص تھا جسے خدا نے قرآن کا علم دے رکھا تھا، پس وہ رات کو اس سے غافل ہو کر سو رہتا اور دن کو بھی اس پر عمل نہ کرتا، لہٰذا اسے قیامت کے دن تک ایسے ہی سزا ملتی رہے گی۔

مندرجہ بالا احادیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ کلام پاک کو یاد کر کے یاد رکھنا کتنا ضروری ہے اور اسے یاد رکھنے کا طریقہ یہی ہے کہ اس کی مسلسل تلاوت کی جاتی رہے ورنہ وہ

بہت جلد بھول جاتا ہے اور قرآن سیکھ کر بھلانا سزا کا مستحق بنا دیتا ہے۔

قرآن پڑھنے اور پڑھانے کی فضیلت: حضرت عثمانؓ بن عفان بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "تم میں بہترین وہ ہے جس نے (خود) قرآن سیکھا اور اسے (دوسروں کو) سکھایا۔" (ترمذی)

حضرت ابو موسیٰؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن پڑھنے والے (مومن) کی مثال سنگترے کی سی ہے کہ اس کا ذائقہ بھی عمدہ ہوتا ہے اور خوشبو بھی عمدہ' اور وہ مومن جو قرآن نہیں پڑھتا اس کی مثال کھجور کی سی ہے کہ اس کا ذائقہ تو عمدہ ہوتا ہے مگر اس میں خوشبو نہیں ہوتی اور جو فاسق قرآن پڑھتا ہے اس کی مثال گل ریحان کی سی ہے کہ اس کی خوشبو عمدہ ہوتی ہے مگر ذائقہ کڑوا ہوتا ہے اور قرآن نہ پڑھنے والے فاسق کی مثال اندرائن کے پھل جیسی ہے کہ اس کا ذائقہ بھی کڑوا ہوتا ہے اور اس میں خوشبو بھی نہیں ہوتی۔ (بخاری)

حضرت عبداللہؓ بن مسعود بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جس نے اللہ کی کتاب کا ایک حرف پڑھا تو اسے ایک نیکی ملے گی اور نیکی دس گنا ہوتی ہے (تو گویا جس نے قرآن پاک کا ایک حرف بھی پڑھا' اسے اس ایک حرف پڑھنے کے عوض دس نیکیوں کا ثواب عطا ہوگا' پھر حضورؐ نے یوں وضاحت فرمائی کہ) میں یہ نہیں کہہ رہا کہ الٓمٓ ایک حرف ہے بلکہ الف ایک (علیحدہ) حرف ہے اور لام ایک (علیحدہ) حرف ہے اور میم ایک (علیحدہ) حرف ہے۔ (تو گویا صرف الٓمٓ پڑھنے ہی سے تیس نیکیاں مل جائیں گی)۔" (ترمذی)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "اگر رشک کرو تو دو چیزوں پر کرو۔ ایک اس شخص پر جسے خدا نے قرآن کا علم دیا اور وہ

اسے دن رات پڑھتا ہے تو اس کا ہمسایہ سن کر کہتا ہے کہ کاش کہ مجھے بھی (قرآن کا علم) دیا جاتا جیسے اس شخص کو دیا گیا ہے تو میں بھی اسی طرح (تلاوت) کرتا جیسے یہ کرتا ہے۔ دوسرے اس شخص پر جسے اللہ نے مال دیا اور وہ اسے راہِ حق میں صرف کرتا ہے' تو (اسے ایسا کرتے دیکھ کر) کوئی شخص کہہ اٹھتا ہے کہ کاش مجھے اس شخص کی طرح (مال) دیا جاتا تو میں بھی اسی طرح (صرف) کرتا جیسے یہ کرتا ہے۔'' (بخاری)

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''قرآن (پڑھنے) والا قیامت کے دن پیش ہوگا تو قرآن کہے گا کہ اے میرے رب' اسے جوڑا پہنا۔ پس اسے عزت اور کرامت کا تاج پہنایا جائے گا۔ پھر قرآن کہے گا کہ اے میرے رب' اسے اور زیادہ پہنا تو اسے عزت اور کرامت کا جوڑا پہنایا جائے گا۔ پھر قرآن کہے گا کہ اے میرے رب' اس سے راضی ہو جا' تو اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو جائے گا۔ پھر اسے کہا جائے کہ (قرآن) پڑھو اور (بلند درجات) پر چڑھ جاؤ اور ہر حرف کے بدلے اس کی ایک نیکی بڑھائی جائے گی۔'' (ترمذی)

حضرت عبداللہؓ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن (پڑھنے) والے سے کہا جائے گا کہ پڑھتا جا اور (بلند درجات پر) چڑھتا جا اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسے تو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرتا تھا۔ جہاں تیری آخری آیت ہوگی وہیں تیری منزل ہوگی۔ (ترمذی)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جس شخص کے سینے میں قرآن کا کوئی حصہ نہیں' وہ اجڑے ہوئے گھر کی مانند ہے۔'' (ترمذی)

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''قرآن

میں مہارت رکھنے والا (قیامت کے دن) پیغام لانے والے عزت دار نیک فرشتوں کے ساتھ ہوگا اور جو (ماہر نہیں اور) قرآن پڑھتے ہوئے اٹکتا ہے اور اسے تلاوت کرتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے تو اس کے لیے دوہرا اجر ہے۔" (مسلم)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو شخص قرآن پڑھتا ہے اور وہ اس کا حافظ ہے تو اس کی مثل ایسے ہے کہ وہ پیغام لانے والے بزرگ (فرشتوں) کے ساتھ ہوگا' اور جو شخص قرآن پڑھتا ہے اور اسے حفظ کرتا ہے اور حفظ کرنا اس پر دشوار ہے تو اس کے لیے دہرا اجر ہے۔" (بخاری)

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جس شخص نے کسی مومن کی دنیوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کی' اللہ تعالیٰ اس سے قیامت کی سختیوں میں سے کوئی سختی دور فرما دے گا۔

اور جس نے کسی تنگدست پر آسانی کی' حق تعالیٰ اس پر دنیا اور آخرت میں آسانی کرے گا۔

اور جس نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی' حق تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی عیب پوشی کرے گا۔

اور جب تک بندہ اپنے (مسلمان) بھائی کی مدد میں لگا دیتا ہے' اللہ تعالیٰ بھی اس کی امداد فرماتا رہتا ہے۔

اور جو شخص حصولِ علم کی راہ پر چلا' حق تعالیٰ اس کے سبب اس کے لیے بہشت کا راستہ آسان کر دے گا۔

اور جو لوگ خدا کے گھر میں سے کسی گھر میں جمع ہوئے اور اللہ کی کتاب کی تلاوت کی اور باہم اسے پڑھتے پڑھاتے رہے تو ان پر سکونِ قلب اترتا ہے اور خدا کی رحمت انہیں

ڈھانپ لیتی ہے اور فرشتے ان پر سایہ کر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر ان (فرشتوں) کے درمیان کرتا ہے جو اس کے پاس ہیں۔

اور جس شخص کو اس کے عمل نے کامیاب کرنے میں دیر لگائی' اس کا نسب اسے کامیاب کرنے میں جلدی نہیں کرے گا۔" (مسلم)

حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ بن العاص سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جس شخص نے کھڑے ہو کر دس آیات پڑھیں وہ غافلوں میں نہیں لکھا جائے گا اور جس نے کھڑے ہو کر سو آیات پڑھیں' وہ فرمانبرداروں میں لکھا جائے گا جو بہت زیادہ ثواب جمع کرتے ہیں۔" (ابوداؤد)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جب آدمی سجدے کی آیت پڑھ کر سجدہ کرتا ہے تو شیطان روتا ہوا علیحدہ ہو جاتا ہے اور کہتا ہے ہائے افسوس' آدم کے بیٹے کو سجدے کا حکم دیا گیا تو اس نے سجدہ کر لیا اور اس کے لیے جنت ہے' لہٰذا مجھے سجدے کا حکم دیا گیا تو میں نے انکار کیا' پس میرے لیے دوزخ ہے۔" (مسلم)

حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم احد کے شہیدوں (کو دفن کرتے وقت ان) میں سے دو دو کو ایک ایک کپڑے میں لپیٹتے تھے اور پھر فرماتے تھے کہ ان میں سے کون قرآن کو زیادہ یاد کرنے والا ہے۔ جب ان میں سے کسی ایک کی طرف اشارہ کیا جاتا تو آپؐ اسے قبر میں پہلے رکھتے۔ (بخاری)

تلاوت کی عمدگی: حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ' میں قرآن کتنی مدت میں ختم کیا کروں۔ آپؐ نے فرمایا کہ ایک مہینے میں ختم کیا کر۔ میں نے عرض کیا کہ مجھ میں اس سے زیادہ پڑھنے کی طاقت ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ

بیس دن میں ختم کیا کر۔ میں نے عرض کیا کہ مجھ میں اس سے زیادہ پڑھنے کی طاقت ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ پندرہ دن میں ختم کیا کہ میں نے عرض کیا کہ مجھ میں اس سے زیادہ پڑھنے کی طاقت ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ دس دن میں ختم کیا کر۔ میں نے عرض کیا کہ میں اس سے زیادہ پڑھنے کی طاقت رکھتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ پانچ دن میں ختم کیا کر۔ میں نے عرض کیا کہ میں اس سے زیادہ پڑھنے کی طاقت رکھتا ہوں مگر آپؐ نے مجھے اس (سے کم دنوں میں قرآن ختم کرنے) کی اجازت نہ دی۔ (ترمذی)

حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جس نے قرآن تین دن سے کم میں ختم کیا' وہ اسے سمجھا نہیں۔" (ترمذی)

خاص خاص سورتوں کی فضیلت: ابوسعیدؓ بن معلیٰ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ کیا میں تمہارے مسجد سے نکلنے سے پہلے پہلے تمہیں قرآن کی سب سے عظیم سورت نہ سکھادوں۔ پھر آپؐ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ جب ہم نے مسجد سے نکلنے کا ارادہ کیا تو میں نے عرض کیا کہ یارسولؐ اللہ آپؐ نے فرمایا تھا کہ آپؐ مجھے قرآن کی سب سے عظیم سورت سکھائیں گے۔ آپؐ نے فرمایا' وہ (سب سے عظیم سورت) الحمد للہ رب العلمین ہے۔ اسی کا نام "سبع مثانی" اور "قرآن عظیم" ہے جو مجھے دی گئی ہے۔ (بخاری)

"سبع مثانی" کا مطلب ہے سات بار دہرائی جانے والی آیات۔ کیونکہ سورۃ الفاتحہ میں سات آیات ہیں' اور یہ نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز جبرئیلؑ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اوپر سے ایک زور کی آواز سنائی دی۔ اس پر آپؐ نے اپنا سر اٹھایا تو جبرئیلؑ بولے کہ یہ آسمان کا ایک دروازہ ہے جو آج کھلا ہے اور جو آج سے پہلے کبھی نہیں کھلا تھا۔ پھر اس میں سے ایک فرشتہ اترا تو جبرائیل نے کہا کہ یہ ایک فرشتہ ہے جو

زمین کی طرف اترا ہے۔ یہ آج سے پہلے کبھی نہیں اترا تھا۔ پھر اس فرشتے نے (حضورؐ کو) سلام کیا اور کہا کہ آپ کو ایسے دو نوروں کی خوشخبری ہو جو آپ کو دیے گئے ہیں اور جو آپؐ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیے گئے۔ ایک سورۃ الفاتحہ اور دوسرے سورۃ البقرہ کا آخری حصہ.....(مسلم)

حضرت اُسید بن حضیر بیان کرتے ہیں کہ وہ رات کو سورۃ البقرہ پڑھ رہے تھے اور ان کا گھوڑا ان کے قریب بندھا ہوا تھا۔ اچانک گھوڑا بدکنے لگا۔ وہ خاموش ہو گئے تو گھوڑا بھی ٹھہر گیا۔ پھر وہ پڑھنے لگے تو پھر گھوڑا بدکنے لگا۔ پھر وہ خاموش ہو گئے تو پھر گھوڑا ٹھہر گیا۔ پھر وہ پڑھنے لگے تو پھر گھوڑا بدکنے لگا۔ اس کے بعد وہ (پڑھنے سے) رک گئے۔ کیونکہ ان کا بیٹا یحییٰ قریب ہی (سویا ہوا) تھا اور وہ ڈرے کہ گھوڑا اسے تکلیف نہ پہنچائے۔ جب انہوں نے اپنے لڑکے کو وہاں سے ہٹا لیا تو انہوں نے آسمان کی طرف سر اٹھایا تو انہیں آسمان نظر نہ آیا۔ بلکہ وہاں ایک چھتری نظر آئی جس میں بہت سے چراغ جڑے ہوئے تھے۔ پھر جب صبح ہوئی تو انہوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سارا واقعہ سنایا تو حضورؐ نے فرمایا کہ اے ابن حضیر تم پڑھتے رہتے' اے ابن حضیر تم پڑھتے رہتے۔ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈرا کہ کہیں وہ یحییٰ کو کچل نہ ڈالے کیونکہ وہ اس کے قریب ہی تھا' اس لیے میں یحییٰ کی طرف متوجہ ہو گیا (پھر انہوں نے بعد کا واقعہ حضورؐ کو بتاتے ہوئے عرض کیا کہ) میں نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا تو (مجھے آسمان نظر نہ آیا بلکہ) ایک چھتری سی نظر آئی جس میں بہت سے چراغ (جڑے ہوئے) تھے۔ پھر میں باہر نکلا تو مجھے وہ نظر نہ آئی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ کیا تم جانتے ہو کہ وہ کیا تھا۔ حضرت ابن حضیر نے عرض کیا کہ نہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہ تو فرشتے تھے جو تیری آواز سن کر قریب آ گئے تھے۔ (بخاری)

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

کہ ''اپنے گھروں کو قبرستان مت بناؤ (بلکہ ان میں قرآن پڑھتے رہو کیونکہ) جس گھر میں سورۃ البقرہ پڑھی جاتی ہے اس میں سے شیطان بھاگ جاتا ہے۔'' (مسلم)

حضرت براءؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص سورۃ الکہف پڑھ رہا تھا اور اس کے پاس ہی ایک گھوڑا رسیوں سے بندھا ہوا تھا۔ اس شخص پر ایک بادل چھا گیا اور بتدریج اس کے قریب آنے لگا اور اس کا گھوڑا بدکنے لگا پھر جب صبح ہوئی تو وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور حضورؐ کو یہ واقعہ بتایا تو حضورؐ نے فرمایا کہ وہ تو سکینہ تھا جو قرآن کے باعث اترا تھا۔ سکینہ یعنی فرشتہ سکون و طمانیت۔ (بخاری)

زید بن اسلم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کسی سفر کے دوران چل رہے تھے۔ ایک رات حضرت عمرؓ بن خطاب آپؐ کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے آپؐ سے کوئی بات پوچھی تو آپؐ نے جواب نہ دیا۔ حضرت عمرؓ نے پھر سوال کیا۔ آپؐ نے پھر جواب نہ دیا۔ حضرت عمرؓ نے پھر (تیسری مرتبہ) پوچھا۔ آپؐ نے پھر جواب نہ دیا۔ اس پر حضرت عمرؓ (سخت پریشان ہوئے اور اپنے آپ کو مخاطب کر کے) بولے۔ تیری ماں تجھے روئے۔ تو نے حضورؐ سے تین بار سوال کیا مگر آپؐ نے تجھے جواب نہ دیا۔ حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ پھر میں نے اپنے اونٹ کو حرکت دی۔ یہاں تک کہ میں لوگوں سے آگے ہو گیا اور میرے دل میں خوف تھا کہ کہیں میرے بارے میں قرآن (کی کوئی آیت) تو نازل ہو جائے۔ ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ میں نے سنا کہ کوئی (مجھے) پکار رہا ہے۔ پس میں ڈر گیا کہ میرے بارے میں قرآن نہ نازل ہو گیا ہو۔ پھر میں حضورؐ کی خدمت میں آیا اور آپؐ کو سلام کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ آج رات مجھ پر ایک ایسی سورت نازل ہوئی ہے جو مجھے ان سب چیزوں سے زیادہ عزیز ہے جن پر سورج طلوع ہوتا ہے۔ پھر آپؐ نے پڑھا: اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا۔ (بے شک ہم نے تمہیں کھلی

کھلی فتح عطا فرمائی) (بخاری)

یہ آیت سورۃ الفتح کی پہلی آیت ہے اور سورۃ الفتح چھبیسویں پارے میں ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (سورہ) قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ تہائی قرآن کے برابر ہے۔ (ترمذی)

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ جمع ہو جاؤ' میں عنقریب تمہارے سامنے تہائی قرآن پڑھتا ہوں۔ حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ پھر جن لوگوں کو جمع ہونا تھا' وہ جمع ہو گئے' تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکلے اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھی اور پھر اندر چلے گئے۔ لوگ ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ میں ابھی تمہارے سامنے تہائی قرآن پڑھتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے یہ خبر آسمان سے آئی ہے۔ پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم (دوبارہ) باہر نکلے اور فرمایا کہ میں نے کہا تھا کہ میں تمہارے سامنے تہائی قرآن پڑھتا ہوں۔ سو سن لو کہ یہ (سورہ اخلاص) تہائی قرآن کے برابر ہے۔ (ترمذی)

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو ایک لشکر کا امیر بنا کر بھیجا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھایا کرتا تھا اور ہمیشہ اسے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پر ختم کیا کرتا تھا۔ جب اہل لشکر واپس لوٹے تو انہوں نے حضورؐ سے اس کا ذکر کیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اس سے پوچھو کہ وہ ایسے کیوں کرتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اسے پوچھا تو اس نے کہا کہ یہ رحمٰن کی صفت ہے اور میں اس بات سے محبت رکھتا ہوں کہ اسے پڑھوں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ اسے بتا دو کہ خدا اس سے محبت رکھتا ہے۔ (بخاری)

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آیا۔ حضورؐ نے کسی شخص کو قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھتے سنا تو آپؐ نے فرمایا کہ واجب ہو گئی۔

میں نے سوال کیا کہ کیا واجب ہوگئی یا رسول اللہ۔ آپؐ نے فرمایا کہ جنت۔ پس میں نے ارادہ کیا کہ اس شخص کے پاس جاؤں اور اسے اس کی خوشخبری دوں مگر مجھے خوف آیا کہ کہیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میرا صبح کا کھانا نہ رہ جائے۔ پس میں نے پہلے حضورؐ کے ساتھ کھانا کھایا اور پھر گیا تو دیکھا کہ وہ شخص جا چکا تھا۔ (مسلم)

صحیح بخاری میں ایک حدیث بیان ہوئی ہے کہ ایک صحابیؓ لوگوں کی امامت کرتے تھے اور ہر رکعت میں سورہ اخلاص ضرور پڑھتے تھے۔ لوگوں نے یہ بات حضورؐ کو بتائی تو حضورؐ نے ان سے کہا کہ تمہیں کس بات نے اس پر آمادہ کیا ہے کہ ہر رکعت میں سورہ اخلاص ضرور پڑھو۔ اس پر وہ شخص کہنے لگا کہ میں اس سورت سے محبت رکھتا ہوں۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ:

''اس کی محبت تمہیں جنت میں داخل کر دے گی''

عقبہ بن عامر جہنیؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ پر اللہ تعالیٰ نے کچھ آیات نازل کی ہیں جن کی مثال دیکھی نہیں گئی (یعنی) قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ والی سورت کے آخر تک اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاس والی سورت کے آخر تک۔

(ترمذی)

حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم علیل ہوتے تو قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ والی سورت اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ والی سورت پڑھ کر اپنے آپ پر دم کرتے۔ پھر جب آپؐ کی بیماری شدید ہوگئی تو میں آپؐ پر یہ سورتیں پڑھتی اور برکت کے لیے خود آپؐ کے ہاتھ کو آپؐ کے جسم پر پھیرتی۔ (بخاری)

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بستر پر تشریف لاتے تو اپنی دونوں ہتھیلیوں کو ملا کر ان پر قل ھو اللّٰہ احد اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاس پڑھ کر ان پر دم کرتے اور پھر انہیں جہاں تک ہو سکتا

اپنے سارے جسم پر پھیر لیتے۔ آپؐ سر اور چہرے اور جسم کے آگے کے حصے سے ہاتھ پھیرنا شروع کرتے۔ آپ تین مرتبہ ایسے کرتے۔ (بخاری)

خاص خاص آیات کی فضیلت: حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے زکوٰۃ (کے مال) کی حفاظت پر مقرر کیا (ایک رات میں اس مال کی حفاظت کر رہا تھا کہ) میرے پاس ایک شخص آیا اور لپ بھر کر اناج لینے لگا۔ میں نے اسے پکڑ لیا اور اس سے کہا کہ خدا کی قسم میں ضرور تجھے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے جاؤں گا۔ وہ کہنے لگا کہ میں محتاج ہوں اور مجھ پر بال بچوں کی ذمہ داری ہے اور مجھے سخت ضرورت ہے۔ اس پر میں نے اسے چھوڑ دیا۔ جب صبح ہوئی تو حضورؐ نے فرمایا کہ اے ابو ہریرہؓ! کل رات تیرے قیدی نے کیا کیا۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ اس نے سخت ضرورت اور اہل وعیال کی (ذمہ داری کی) شکایت کی تو مجھے اس پر رحم آ گیا اور میں نے اسے چھوڑ دیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ یاد رکھو کہ اس نے تمہارے ساتھ جھوٹ بولا ہے اور وہ پھر آئے گا' پس حضورؐ کے یہ فرمانے سے کہ وہ پھر آئے گا مجھے یقین ہو گیا کہ وہ (واقعی) پھر آئے گا پس میں اس کی تاک میں رہا چنانچہ وہ پھر آیا اور اناج کی لپ بھر کر لینے لگا تو میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ میں ضرور تمہیں رسولؐ خدا کی خدمت میں لے کر جاؤں گا۔ اس نے کہا۔ مجھے چھوڑ دو' میں محتاج ہوں اور مجھ پر بال بچوں کی ذمہ داری ہے' میں اب پھر نہیں آؤں گا۔ پھر مجھے اس پر رحم آ گیا اور میں نے اسے چھوڑ دیا۔ پھر صبح ہوئی تو حضورؐ نے مجھ فرمایا کہ اے ابو ہریرہؓ تیرے قیدی نے کیا کیا۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ اس نے شدید ضرورت اور اہل وعیال (کی ذمہ داری) کی شکایت کی تو مجھے اس پر رحم آ گیا اور میں نے اسے چھوڑ دیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ یاد رکھو کہ اس نے تم سے جھوٹ بولا ہے اور وہ پھر آئے گا۔ پس میں تیسری مرتبہ اس کی تاک میں بیٹھ گیا۔ چنانچہ وہ آیا اور لپ بھر کر اناج لینے لگا تو

میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ میں ضرور ہی تجھے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے جاؤں گا۔ یہ تیسری بار ہے کہ تو کہتا ہے کہ میں نہیں آؤں گا مگر پھر آجاتا ہے۔ اس نے کہا کہ مجھے چھوڑ دو' میں تجھے کچھ کلمات سکھاؤں گا' جن سے اللہ تجھے فائدہ دے گا۔ میں نے کہا۔ وہ کیا ہیں۔ اس نے کہا۔ جب تم اپنے بستر پر جاؤں تو آیۃ الکرسی اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ آیت کے آخر تک پڑھ لیا کرو تو صبح تک اللہ کی طرف سے ایک فرشتہ تمہاری حفاظت کرتا رہے گا اور شیطان ہرگز تمہارے قریب نہیں آئے گا۔ چنانچہ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ پھر صبح ہوئی تو حضورؐ نے مجھ سے فرمایا کہ کل رات تیرے قیدی نے کیا کیا۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ اس نے کہا تھا کہ وہ مجھے کچھ کلمات سکھائے گا جن سے اللہ مجھے فائدہ دے گا۔ اس لیے میں نے اسے چھوڑ دیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہ کیا تھے۔ میں نے عرض کیا کہ اس نے مجھے کہا جب تو اپنے بستر پر جائے تو آیۃ الکرسی اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ کو شروع سے آخر تک پڑھ لے اور اس نے مجھے بتایا کہ صبح تک اللہ کی طرف سے ایک فرشتہ تمہاری حفاظت کرتا رہے گا اور شیطان تمہارے پاس نہیں آنے پائے گا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ البتہ یہ بات اس نے تمہیں سچی بتائی ہے۔ ویسے وہ ہے بڑا جھوٹا (پھر حضورؐ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا' اے ابو ہریرہؓ کیا تم جانتے ہو کہ تین راتوں سے یہ کون تمہارے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے عرض کیا کہ نہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہ شیطان تھا۔ (بخاری)

اس حدیث سے جو بات واضح ہوتی ہے اور جس کی حضورؐ نے خود تصدیق فرمائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جو شخص رات کو آیۃ الکرسی پڑھے گا' اسے رات بھر خدا کی طرف سے حفاظت حاصل رہے گی اور شیطان اس کے قریب نہیں آسکے گا۔

حضرت ابو مسعودؓ انصاری بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

کہ "سورۃ البقرہ کے آخری میں دو آیتیں ایسی ہیں، جس نے انہیں رات کے وقت پڑھا تو وہ اس کے لیے کافی ہوں گی۔" (بخاری)

حضرت ابو الدرداء بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے سورۃ الکہف کی ابتدائی تین آیات پڑھیں وہ دجال کے فتنے سے محفوظ رہے گا۔ (ترمذی)

قرآن پر غور و تدبر: سورہ ص آیت ۲۹ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

كِتَابٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ○

"یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے جو (اے نبیؐ) ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر تدبر کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق لیں۔"

"تدبر" کا مفہوم عام سیدھی سادی زبان میں یہ ہے کہ آیاتِ قرآنی کو اچھی طرح سمجھ سمجھ کر پڑھیں اور اس کے مطلب پر غور و فکر کریں۔ کسی شے کو عام انداز میں پڑھ جانے اور اس پر "تدبر" کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ جو چیز ہم سرسری طور پر پڑھ جاتے ہیں، وہ بھی ہمیں کچھ نہ کچھ فائدہ دے ہی دیتی ہے مگر اتنا نہیں دیتی جتنا ہمیں اس صورت میں حاصل ہوتا ہے جب ہم اس کو سمجھ سمجھ کر پڑھتے ہیں اور اس کے مطالب پر غور و فکر کرتے ہیں۔ غور و فکر کرنے سے صرف یہی نہیں ہوتا کہ وہ چیز اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے بلکہ ایسا کرنے سے دل اس پر عمل کرنے کے لیے بھی تیار ہو جاتا ہے۔

اب قرآن پاک کے بارے میں یہ جو فرمایا گیا ہے کہ اس کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اس کی آیتوں پر غور و فکر کریں، تو اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید کی

تلاوت کا پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ ہم اسے سمجھ سمجھ کر پڑھیں اور اس کے مطالب پر غور و فکر کریں تا کہ اچھی طرح پتہ چل جائے کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں کیا کیا ہدایات دی ہیں' ان ہدایات پر عمل کرنے کے کیا کیا فوائد ہیں اور ان پر عمل نہ کرنے سے کن کن نقصانات کا خطرہ ہے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پاک کی تلاوت کی تاکید تو فرمائی ہے مگر یہ پابندی نہیں لگائی کہ روزانہ قرآن کا اتنا اور اتنا حصہ ضرور پڑھا جائے۔ بے شک انسان چند آیات ہی روزانہ پڑھے مگر پڑھے سمجھ سمجھ کر اور ساتھ ساتھ ان پر غور و فکر بھی کرتا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو قرآن جیسی نعمت اس لیے عطا فرمائی تھی کہ وہ اس کے احکام پر عمل کر کے دونوں جہان کی خیر و برکت اور کامیابی حاصل کرے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے ساتھ اس بات کو سمجھا جاتا رہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے کیا کیا احکام دیے ہیں' کن کن باتوں سے منع فرمایا ہے' کیا کیا عبرتناک واقعات بیان فرمائے ہیں جن سے عبرت حاصل کرنا ضروری ہے' کس گناہ کی کیا سزا ہے' کس نیکی کا کیا اجر ہے' کس طرح کائنات میں ہر طرف خدا کی قدرت کی نشانیاں بکھری پڑی ہیں جن پر غور کرنے سے انسان خدا تعالیٰ کی ہستی اور صفات کو ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے' کس طرح نیک اعمال آخرت کی کامیابی کے علاوہ اس مادی دنیا میں بھی زندگی کو سکھی بناتے ہیں اور کس طرح برائیاں اور گناہ آخرت کے عذاب کے علاوہ اس دنیوی زندگی کو بھی جہنم کا نمونہ بنا کر رکھ دیتے ہیں' وغیرہ۔

تلاوتِ قرآن کے آداب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تلاوت شروع کرنے سے پہلے تعوذ کیا جائے۔ تعوُّذ کرنے کا مطلب ہے خدا کی پناہ مانگنا یعنی یہ پڑھنا۔

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. میں شیطان مردود سے خدا کی پناہ مانگتا (یا مانگتی) ہوں۔

تلاوت سے پہلے تعوذ کی ہدایت اس لیے کی گئی ہے کہ تلاوت کے دوران شیطان گمراہ کرنے کی کوشش نہ کرے۔ ویسے تو شیطان ہر وقت اسی کوشش میں ہوتا ہے کہ انسان کو گمراہ کرے مگر جب انسان کوئی عملِ نیک شروع کرتا ہے اور شیطان کو خطرہ پیدا ہوتا ہے کہ اب یہ اللہ کی رحمت حاصل کر لے گا تو وہ زیادہ ہی مضطرب ہو کر اسے گمراہ کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا ہے۔ تلاوت کے دوران اس کے انسان کو گمراہ کرنے کی کوششیں مختلف شکلوں میں ہوتی ہیں۔ کبھی وہ پڑھنے والے کے ذہن کو آیات کے مفہوم کے بارے میں الٹے اور گمراہ کن مطالب سمجھاتا ہے اور کبھی اس کے دل و دماغ کو قرآن کی طرف یکسوئی سے متوجہ ہونے اور اس کی آیات پر غور و فکر کرنے سے ہٹا کر کسی اور طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ ایک شخص زبان سے تو تلاوت کر رہا ہو مگر اس کے ذہن اور دماغ کو شیطان نے کسی اور ہی بات میں مصروف کر رکھا ہو۔ اس لیے ہدایت دی گئی ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کر لو کہ وہ تمہیں شیطان کے بہکاوے سے اپنی پناہ میں رکھے اور پھر تلاوت کرو۔

تلاوت میں یکسوئی اور غور و فکر قائم رکھنے کے لیے اس بات کو یاد رکھیں کہ جس خالق اکبر کا کلام آپ پڑھ رہے ہیں، وہ کمال محبت اور خوشی سے آپ کے پاس ہی بیٹھا آپ کی تلاوت سن رہا ہے۔ کتنی بڑی گستاخی اور بے ادبی ہے کہ آپ اس کی اور اس کے کلام کی طرف سے توجہ ہٹا کر اور اور باتیں سوچنا شروع کر دیں۔

یہاں ایک بات کو واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ قرآن کو سمجھ کر پڑھنے پر بجا طور پر زور دیتے ہوئے ایک ایسی بات بھی کہہ جاتے ہیں، جو بذاتِ خود "بجا" نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن صرف اس لیے دیا تھا کہ اسے پڑھ کر اس کے احکام پر عمل کیا جائے۔ اس لیے جو لوگ قرآن کو صرف ناظرہ پڑھے ہوئے ہیں اور تلاوت کرتے ہوئے اس کے مفہوم کو سمجھ نہیں رہے ہوتے۔ ان کا تلاوت کرنا "محض بے

فائدہ" ہے۔

یہ بات بڑی غیر ذمہ دارانہ ہے اور اسے منہ سے نہیں نکالنا چاہیے۔ کیونکہ بلاشبہ سمجھ کر پڑھنے کی فضیلت اور فوائد بہت زیادہ ہیں مگر بغیر سمجھے تلاوت کرنے کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ "بالکل بے فائدہ" ہے انتہائی غلط بات ہے۔ خدا کے کلام کی ایک اپنی برکت ہے جو ناظرہ پڑھنے والے کو بھی ضرور پہنچتی ہے۔ ناظرہ تلاوت کرنے سے بھی اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط ہوتا ہے، دل میں پاکی پیدا ہوتی ہے اور یہ عالم اسلام کے تمام مسلمانوں کے درمیان ایک رابطے کا کام دیتی ہے۔

عالم اسلام کے کروڑہا کروڑ مسلمان ان گنت زبانیں بولتے ہیں۔ ان میں بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو عربی زبان تو نہیں سیکھ سکتے مگر کوشش کر کے ناظرہ قرآن پڑھنا سیکھ لیتے ہیں اور اس طرح قرآن سے ان کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ اب اگر ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے کہ ناظرہ تلاوت کا تو سرے سے کوئی فائدہ ہی نہیں تو نتیجہ سخت مضر ہوگا، کیونکہ عربی زبان تو وہ سیکھ سکیں گے ہی نہیں اور ناظرہ قرآن بھی چھوڑ بیٹھیں گے اور اس طرح قرآن سے ان کا تعلق بالکل ہی ختم ہو جائے گا۔ عالم اسلام کی کم و بیش اسی نوے کروڑ آبادی سے آپ یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ سبھی اتنی عربی سیکھ لیں کہ قرآن کو براہ راست سمجھ کر اس کی تلاوت کریں۔ ناظرہ تلاوت کرنے کے طریقے نے ایک لحاظ سے ایک مفید کام کیا ہے کہ اس نے عربی زبان جاننے والوں اور نہ جاننے والوں سب کو قرآن سے مربوط رکھا ہے۔

بعض جگہ یہ بھی سوچا گیا کہ اس مسئلے کو اس طرح حل کیا جائے کہ ہر مسلمان قوم اپنی زبان میں قرآن کا ترجمہ کر لے اور اپنی زبان ہی میں اس کی تلاوت کرے تاکہ لوگ پڑھتے ہوئے سمجھیں بھی۔ لیکن یہ مسئلے کا حل نہیں بلکہ ایک فتنے کا آغاز ہے۔ اس سے اخوتِ اسلامی پر گہری ضرب لگنے کا خطرہ ہے۔ اب تو یہ صورت ہے کہ قطب شمالی کا مسلمان

ہو یا قطب جنوبی کا، ایشیا کا رہنے والا ہو یا افریقہ کا' آسٹریلیا کا باسی ہو یا یورپ کا' امریکہ کا باشندہ ہو یا کسی چھوٹے سے سمندری جزیرے کا' جس جگہ بھی کوئی مسلمان تلاوت کر رہا ہوگا' وہ اللہ تعالیٰ کے اپنے الفاظ ہی زبان سے ادا کر رہا ہوگا اور یہ عالمگیر ہم رنگی اور یک جہتی تمام مسلمانوں کے درمیان ایک مضبوط رابطے کا کام دیتی ہے۔ لیکن اگر ہر کوئی اپنی اپنی زبان میں تلاوت شروع کر دے گا تو مسلمان ان گنت ٹکڑوں میں بٹ جائیں گے۔

پھر نماز کا مسئلہ بھی ہے۔ نماز کے دوران بھی قرآن پڑھا جاتا ہے۔ اب چونکہ ہر جگہ نماز عربی زبان ہی میں ادا ہوتی ہے اور اس کے دوران قرآن کا اپنا عربی متن ہی پڑھا جاتا ہے اس لیے ایک دوسرے سے ہزاروں لاکھوں میلوں کی مسافت پر رہنے والے اور بالکل مختلف زبانیں بولنے والے مسلمان بھی ایک امام کے پیچھے نماز پڑھ لیتے ہیں جو اس صورت میں ممکن نہیں کہ ہر مسلمان قوم اپنی علاقائی زبان میں تلاوت کرے اور اپنی ہی زبان میں نماز پڑھے۔

غرضکہ ناظرہ قرآن پڑھنے کے دستور کے کچھ اپنے فوائد بھی ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا' البتہ وہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ جو شخص ایسے دل و دماغ کا مالک ہو کہ ترجمہ اور تشریح سمجھ سکے' اس کو محض سستی کے باعث اس طرف سے لاپروائی نہیں برتنا چاہیے بلکہ قرآن کو سمجھ کر پڑھنا چاہیے اور اس پر غور و تدبر کر کے اس کے مطالب کو اس طرح ذہن نشین کرنا چاہیے کہ اعمال و افعال بھی بدل کر قرآن کے سانچے میں ڈھلتے چلے جائیں۔

صحابہ کرامؓ کا طریقہ تھا کہ تلاوت کے علاوہ قرآن پر غور و تدبر بھی فرمایا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

"میں "الْقَارِعَہ" اور "الْقَدْر" جیسی چھوٹی چھوٹی سورتوں کو سوچ سمجھ کر پڑھنا اس سے زیادہ بہتر سمجھتا ہوں کہ "الْبَقَرَۃ" اور "اٰلِ عِمْرٰن" جیسی بڑی بڑی سورتیں فر فر پڑھ جاؤں اور کچھ نہ سمجھوں۔"

ظاہر ہے کہ قرآن پر غور و فکر کرنے کی تلقین اسی لیے کی گئی ہے کہ انسان کے عقیدے اور اعمال درست ہوں اور وہ زندگی گزارتے ہوئے ان احکام پر چلے جو قرآن نے دیے ہیں۔ حضرت حسن بصریؒ اپنے عہد کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اسلاف کو پورا پورا یقین تھا کہ قرآن خدا کا فرمان ہے اور اسی کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ چنانچہ وہ راتوں کو غور و فکر کے ساتھ اس کی تلاوت کرتے اور دن کو اس کے احکام پر عمل کرتے تھے۔ مگر تم لوگوں کا حال یہ ہے کہ بس اس کے الفاظ پڑھتے ہو، اس کے حروف کی زیر زبر درست کرتے ہو اور رہا عمل تو اس میں نہایت سست اور کوتاہ ہو۔''

امام مالکؒ بیان کرتے ہیں کہ ان تک یہ بات پہنچی کہ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ سورۃ البقرہ آٹھ برس تک سیکھتے رہے۔'' (موطا)

واضح رہے کہ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کی مادری زبان ہی عربی تھی اور سورۃ البقرہ ان کے لیے ایسے ہی تھی جیسے ہم میں سے کوئی اردو کی کوئی تحریر پڑھے، تو پھر وہ آٹھ برس تک کیا سیکھتے رہے؟ اس کا جواب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ انہیں سورۃ البقرہ کے مطالب پر غور کرنے اور اپنی زندگی میں ان احکام کو نافذ کرنے میں اتنی دیر لگی ہوگی۔

صحیح مسلم میں حضرت جریرؓ کی طرف سے بیان ہوا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ خدا کی کتاب میں ہدایت اور نور ہے، جو اسے مضبوطی سے پکڑے اور تھامے رہے گا وہ ہدایت پائے گا اور جس نے اسے چھوڑ دیا وہ گمراہ ہو گیا۔

مختصر یہ کہ قرآن پاک کا رمضان پاک سے گہرا تعلق ہے اور اس ماہ کے دوران تلاوت کی طرف خصوصی توجہ بہت اجر و ثواب کا باعث ہے اور اگرچہ ناظرہ قرآن پڑھنے کی بھی بہت خیر و برکت ہے تاہم سوچ سمجھ کر پڑھنا اور قرآنی آیات پر غور و تدبر کرنا زیادہ ہی فائدے اور فضیلت کی بات ہے۔

تراویح، آخری عشرہ، اعتکاف، شب قدر

تراویح: تراویح، جیسے کہ سب جانتے ہیں، ان نوافل کو کہا جاتا ہے جو رمضان کے دوران، نماز عشاء کے بعد پڑھے جاتے ہیں۔ بعض علماء کے خیال کے مطابق ان کی تعداد آٹھ ہے اور بعض کی رائے میں بیس ہے۔

لفظ "تراویح" جمع ہے "ترویحہ" کی جس کا مطلب ہے "آرام لینے کے لیے تھوڑی دیر بیٹھنا۔" تراویح پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ دو دو رکعت کر کے پڑھی جاتی ہیں اور ہر چار رکعتوں کے بعد "ترویحہ" کرتے ہیں یعنی تھوڑی دیر بیٹھ کر آرام کرتے ہیں۔ اس لیے اس نماز کا نام بھی "نماز تراویح" ہو گیا۔

نماز تراویح مسنون نماز ہے یعنی وہ نماز ہے جسے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا ہے۔ صحابہ کرامؓ بھی اسے پڑھتے رہے ہیں۔ نماز تراویح مرد عورت سب کے لیے ہے۔ ایک بات جو خاص طور پر یاد رکھی جانے والی ہے، وہ یہ ہے کہ اس نماز کا تعلق رمضان سے ہے روزے سے نہیں۔ یعنی اگر کسی شخص نے روزہ نہ بھی رکھا ہو تو بھی اسے نماز تراویح پڑھنی چاہیے۔ یہ جو بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جس دن روزہ نہ ہو اس دن تراویح پڑھنے کی ضرورت نہیں، یہ غلط ہے۔ دونوں عبادتیں الگ الگ ہیں۔ روزہ اپنی جگہ ہے اور تراویح اپنی جگہ۔

نماز تراویح کے بارے میں احادیث پاک سے پتہ چلتا ہے کہ ایک رات حضورؐ

نے یہ نماز پڑھی۔ لوگوں نے دیکھا تو وہ بھی شامل ہو گئے۔ اسی طرح دوسری اور تیسری رات بھی ہوا کہ آپؐ نے یہ نماز پڑھی اور ساتھ لوگوں نے بھی پڑھی۔ چوتھی رات آئی تو اس قدر زیادہ لوگ اکٹھے ہو گئے کہ ان کا مسجد میں سمانا مشکل ہو گیا۔ اس رات حضورؐ گھر سے ہی نہ نکلے اور لوگ بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ اگلے روز حضورؐ نے بتایا کہ مجھے تم لوگوں کے انتظار کرنے کا علم تھا، مگر میں تو اس خوف کے باعث باہر نہ آیا کہ کہیں یہ نماز تم لوگوں پر فرض ہی نہ ہو جائے اور پھر تم اسے ادا نہ کر سکو۔ یہ مضمون ذیل کی حدیث میں بیان ہوا ہے۔

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم (رمضان کے دوران) ایک رات کو نصف شب کے وقت (گھر سے) نکلے اور مسجد میں نماز ادا کی اور کچھ لوگوں نے بھی آپؐ کے پیچھے نماز پڑھی۔ صبح ہوئی تو لوگوں نے (اس بات کا) چرچا کیا۔ (دوسری رات) اس سے زیادہ لوگ جمع ہو گئے اور حضورؐ کے ساتھ نماز ادا کی۔ پھر صبح ہوئی تو لوگوں نے ایک دوسرے سے (اس کا) ذکر کیا۔ پس تیسری رات مسجد میں بہت لوگ جمع ہو گئے۔ پھر حضورؐ (گھر سے) نکلے اور نماز ادا کی اور ان لوگوں نے بھی آپؐ کے ساتھ ادا کی۔ پھر جب چوتھی رات آئی تو مسجد میں اتنے لوگ تھے کہ سمانا مشکل ہو گیا (لیکن حضورؐ باہر تشریف نہ لائے اور اپنے گھر ہی میں رہے) یہاں تک کہ صبح کی نماز (ہی) کے لیے نکلے۔ پھر جب فجر کی نماز ہو چکی تو آپؐ نے لوگوں کی طرف رخ کیا اور تشہد پڑھ کر فرمایا۔ امّا بعد تم لوگوں کا (یہاں) موجود ہونا مجھ سے مخفی نہ تھا (مجھے معلوم تھا کہ تم نماز پڑھنے کے لیے یہاں جمع ہو) لیکن (میں اس لیے باہر نہ آیا کہ) مجھے خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں (یہ نماز) تم پر فرض نہ ہو جائے، پھر تم اسے ادا نہ کر سکو۔ (حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ) پھر حضورؐ کے وفات پانے تک صورتِ حالات ایسی ہی رہی (یعنی روزانہ باقاعدگی سے باجماعت نماز تراویح نہیں ہوا کرتی تھی)۔ (بخاری)

اس حدیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ نماز تراویح فرض تو نہیں مگر سنت ضرور ہے۔

ذیل کی حدیث بھی اس مسئلے پر روشنی ڈالتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں تراویح پڑھنے کی ترغیب دلاتے تھے مگر بطور وجوب ان کا حکم نہیں فرماتے تھے۔ آپؐ فرماتے تھے کہ جس نے رمضان میں ایمان کے ساتھ اور خاص خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی نیت سے عبادت کی اس کے اس سے پہلے کے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔

ابن شہاب بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے وفات پانے تک صورت یہی تھی (کہ تراویح پڑھی جاتی تھیں مگر انہیں لازم نہیں سمجھا جاتا تھا) پھر یہی صورت حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں اور حضرت عمرؓ کے عہد کے شروع کے حصے میں رہی۔ (موطا)

نماز تراویح کو باقاعدہ باجماعت پڑھنے کا نظام حضرت عمرؓ کے عہد میں شروع کیا گیا تھا۔ ذیل کی حدیث بتاتی ہے کہ اس بندوبست کا آغاز کیسے ہوا۔

عبدالرحمٰن بن عبدالقاری بیان کرتے ہیں کہ رمضان میں ایک رات میں حضرت عمرؓ بن خطاب کے ساتھ مسجد کی طرف جا نکلا اور دیکھا کہ لوگ مختلف ٹکڑیوں میں (تراویح پڑھ رہے) ہیں۔ کہیں کوئی ایک شخص اکیلا نماز پڑھ رہا ہے اور کہیں ایک کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی پڑھ رہے ہیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ اگر میں ان سب کو ایک قاری پر جمع کر دوں تو یہ بہتر ہوگا (یعنی ایک ہی امام کے پیچھے سب تراویح پڑھا کریں) پھر اس کا عزم کر کے آپؓ نے انہیں حضرت ابیؓ بن کعب پر جمع کر دیا (کہ سب اکٹھے ہو کر ان کے پیچھے تراویح پڑھا کریں) پھر ایک اور رات میں حضرت عمرؓ کے ساتھ نکلا تو (دیکھا) کہ سب لوگ اپنے قاری کے پیچھے تراویح پڑھ رہے ہیں (یہ دیکھ کر) حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یہ بہت اچھی بدعت ہے (اور فرمایا کہ رات کے) جس حصے میں یہ سو جاتے ہیں وہ اس

حصّے سے افضل ہے جس میں یہ کھڑے ہوکر نماز پڑھتے ہیں۔ آپؓ کی مراد رات کا آخری حصّہ تھا (راوی کہتے ہیں کہ) لوگ رات کے پہلے حصے میں عبادت کیا کرتے تھے۔ (بخاری)

پھر اس زمانے سے لے کر آج تک عالمِ اسلام میں نماز تراویح کو باقاعدگی سے باجماعت پڑھنے کا بندوبست قائم ہے اور اس نظام نے مسلمانوں کو بے پناہ خیر و برکت عطا کی ہے اور گوناگوں فوائد بہم پہنچائے ہیں۔

پہلی بات تو یہی ہے کہ اس نظام کی برکت سے لوگ اہتمام اور پابندی کے ساتھ رمضان کی راتوں میں عبادت کر لیتے ہیں۔ اگر یہ نظام قائم نہ کیا جاتا تو شاید اتنے زیادہ لوگ اتنی پابندی اور نظم سے رمضان کی خصوصی عبادت نہ کر پاتے۔ حضورؐ کی زندگی میں تو یہ خدشہ موجود تھا کہ یہ نماز فرض ہو کر مسلمانوں کے لیے ایک اور فرض نہ بڑھا دے مگر حضورؐ کے تشریف لے جانے کے بعد یہ خدشہ تو ختم ہو گیا۔ اب تو یہ نماز ہمیشہ سنت ہی رہے گی جسے کسی وقت چھوڑا بھی جا سکتا ہے۔ لہٰذا اس نظام کے قیام نے مسلمانوں کے لیے موقع بہم پہنچا دیا ہے کہ زیادہ آسانی سے رمضان کی راتوں میں عبادت کر لیں۔

نظام تراویح مسلمانوں میں اتنا مقبول رہا ہے اور اب بھی ہے کہ ادھر رمضان شروع ہوا ادھر مساجد نمازیوں سے بھرنا شروع ہو گئیں۔ بے شمار لوگ ایسے بھی ہیں جو عام دنوں میں نماز کی پابندی نہیں کرتے مگر رمضان کے دوران تراویح میں شرکت کرنے کے لیے فرض نماز بھی پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ تراویح کا یہ نظام مسلمانوں کی بستیوں کی ایک نمایاں علامت بنا ہوا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ تراویح کے نظام نے مسلمانوں میں حفیظ قرآن کے شوق کو بہت تحریک دلائی ہے۔ چونکہ ہر مسجد میں رمضان کے دوران نمازیوں کو تراویح میں کم از کم

ایک دفعہ پورا قرآن ضرور سنایا جانا ہوتا ہے اس لیے حافظوں کی ضرورت پیش آنے لگی اور ایک کثیر تعداد نے ذوق وشوق سے حفظ قرآن کی طرف توجہ کر کے اس ضرورت کو پورا کرنے کی سعی شروع کر دی۔ یہ ذوق وشوق اب بھی موجود ہے اور مسلمان ممالک اور آبادیوں میں خدا کے فضل سے' ایسے لوگ آسانی سے مل جاتے ہیں جو رمضان کے دوران میں مساجد میں لوگوں کو تراویح پڑھاتے اور قرآن پاک سناتے ہیں۔

پھر جن لوگوں نے تراویح میں قرآن سنانا ہوتا ہے انہیں ضرورت ہوتی ہے کہ انہیں قرآن بھولنے نہ پائے۔ اس لیے وہ سال کے عام دنوں میں بھی قرآن پاک کے دور کرتے رہتے ہیں تا کہ جو نوران کے سینوں میں سما چکا ہے وہ نکلنے نہ پائے۔ کیونکہ قرآن کی خصوصیت ہے کہ اگر اس کی طرف سے غفلت برتی جائے تو یہ جلد ہی ذہن سے نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس طرح تراویح کے نظام نے مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ کو قرآن حفظ کرنے اور اسے یاد رکھنے کے لیے اسے بار بار پڑھنے میں مصروف کر رکھا ہے جو امت کے لیے بڑی خیر و برکت کی بات ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نماز تراویح کی فضیلت اور خیر و برکت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس سلسلے میں بعض ان ممالک کے ساتھ' جو مرکز اسلام سے بہت دور تھے' اللہ تعالیٰ کا خاص فضل رہا۔ چنانچہ پاکستان و ہندوستان میں تراویح اور ختم قرآن کا جتنا اہتمام ہے اور عوام و خواص سب اس کے گرویدہ ہیں یہ بات اس درجے میں کسی اور ملک میں نہیں ملتی۔ یہاں محلے کی چھوٹی چھوٹی مسجدوں میں بھی تراویح کا اہتمام کیا جاتا ہے اور کم از کم ایک ختم ضرور ہوتا ہے۔ بڑی اور خاص مساجد میں کئی کئی ختم ہوتے ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس سنت کے التزام کی وجہ سے حفاظ کی تعداد میں بہت نمایاں اضافہ ہوا اور رمضان کی خاطر پورے سال قرآن مجید کا دور معمول بن گیا اور ایسے ایسے حفاظ پیدا ہوئے جو

حیرت انگیز کمالات رکھتے تھے اور حفظِ قرآن کے شعبے میں غیر معمولی اور ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔" (ارکان اربعہ)

تراویح کے نظام کا ایک اور بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہر مسلمان اپنی عام تلاوت کے علاوہ تراویح کے ذریعے مہینے میں کم از کم ایک بار پورا قرآن سن لیتا ہے۔ قرآن پاک کا سننا بھی بڑی فضیلت کی بات ہے۔ یہ عمل عام دنوں میں بھی اجر و ثواب کا باعث ہے۔ کجا یہ کہ رمضان کے دوران' نماز پڑھتے ہوئے' کھڑے ہو کر قرآن سنا جائے۔ حضورؐ خود قرآن پڑھنے کے علاوہ کسی دوسرے سے قرآن سننے کو بھی پسند فرماتے تھے۔

حضرت عبداللہؓ بن مسعود بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ "میرے سامنے قرآن کریم کی تلاوت کرو۔" میں نے عرض کیا کہ کیا میں آپؐ کے سامنے پڑھوں' حالانکہ آپؐ پر قرآن نازل ہوا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ "مجھے یہ پسند ہے کہ دوسروں سے سنوں۔" اس پر میں نے آپؐ کے سامنے سورۂ نساء کی تلاوت کی' یہاں تک کہ جب میں اس آیت پر پہنچا۔

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ط

تو آپؐ نے فرمایا کہ اب بس کرو۔ میں نے آپؐ کی طرف نگاہ کی تو دیکھا کہ آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ (بخاری' مسلم)

اس حدیث میں جو آیت بیان ہوئی اس کا ترجمہ ہے:

"اس وقت یہ کیا کریں گے جب کہ ہم ہر قوم میں سے ایک گواہ لائیں گے اور تم کو ان سب پر گواہ بنائیں گے۔"

آخری عشرہ: عشرہ دس دن کی مدت کو کہا جاتا ہے اور رمضان تین عشروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلے روزے سے دسویں تک پہلا عشرہ' پھر گیارہویں روزے سے بیسویں تک دوسرا

عشرہ اور پھر اکیسویں روزے سے رمضان کے اختتام تک تیسرا عشرہ چاہے نو دن کا ہو یا دس دن کا۔ اس آخری عشرے کی خاص طور پر بہت فضیلت آئی ہے۔

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ جب (رمضان کا آخری) عشرہ آتا تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم رات کو بیدار رہتے اور اپنے گھر والوں کو بھی جگاتے (کہ اٹھ کر عبادت کریں) اور (عبادت میں بہت) کوشش فرماتے اور (اس کے لیے) کمرِ ہمت باندھ لیتے۔ (مسلم)

حضرت عائشہؓ ہی کا بیان ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم (رمضان کے) آخری دس دنوں میں اتنی کوشش اور محنت سے عبادت کرتے تھے جتنی کوشش اور محنت سے رمضان کے علاوہ دوسرے دنوں میں نہیں کرتے تھے (مسلم)

یہ احادیث واضح کر رہی ہیں کہ رمضان کے آخری عشرے میں خاص طور پر زیادہ عبادت کرنے کا اہتمام ہونا چاہیے، خصوصاً اس عشرے کی طاق راتوں میں یعنی اکیسویں، تیئسویں، پچیسویں، ستائیسویں اور انتیسویں رات کو۔

اسی عشرے کا دو اور چیزوں سے تعلق ہے جن کے بارے میں ضروری معلومات حاصل ہونی چاہئیں۔

ایک اعتکاف۔

اور دوسرے لیلۃ القدر۔

اعتکاف: اعتکاف اس خاص عبادت کا نام ہے جو ہمت والے لوگ رمضان کے آخری عشرے میں، لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر اور مسجد میں رہ کر کرتے ہیں۔ مولانا محمد یوسف اصلاحی اپنی تالیف ''آسان فقہ'' جلد دوم صفحہ ۲۳۶ پر اعتکاف کی تعریف یوں بیان فرماتے ہیں:

''لغت میں کسی جگہ میں بند ہونے یا کسی مقام پر ٹھہرنے کو اعتکاف کہتے ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں اعتکاف سے مراد یہ ہے کہ آدمی دنیوی تعلقات و مصروفیات اور بیوی بچوں سے الگ ہو کر مسجد میں قیام کرے۔ اعتکاف یہی تو ہے کہ آدمی دنیوی کاروبار اور تعلقات سے کٹ کر، اور گھریلو مصروفیات اور نفسانی خواہشات سے بے تعلق ہو کر، فکر و عمل کی ساری قوتوں کو خدا کی یاد اور عبادت میں لگا دے اور سب سے الگ تھلگ ہو کر خدا کے پڑوس میں جا بسے۔ اس عمل سے ایک طرف تو آدمی ہر قسم کی غلو باتوں اور برائیوں سے محفوظ رہے گا، دوسری طرف خدا سے اس کا تعلق مضبوط ہوگا، اس کا قرب حاصل ہوگا اور اس کی یاد اور عبادت سے قلب و روح کو سکون اور سرور محسوس ہوگا اور چند دن کی تربیت کا یہ عمل اس کے دل پر گہرا اثر چھوڑے گا کہ دنیا میں اپنے چاروں طرف ہر طرح کی رنگینیاں اور دلکشیاں دیکھنے کے باوجود خدا سے تعلق مضبوط رکھے۔ خدا کی نافرمانی سے بچے، اس کی اطاعت میں قلب و روح کا سکون و سرور تلاش کرے اور پوری زندگی خدا کی بندگی میں گزارے۔''

حافظ ابن قیمؒ اعتکاف کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اعتکاف کی روح اور اس سے مقصود یہ ہے کہ دل اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ ہو جائے۔ اس کے ساتھ جمعیتِ باطنی حاصل ہو اور لوگوں میں مشغول رہنے سے رہائی حاصل ہو اور حق میں مشغول رہنے کی نعمت میسر آئے اور یہ حال ہو جائے کہ تمام اقسام کے فکر، تردد، غم اور وسوسوں کی جگہ اللہ کا ذکر اور اس کی محبت لے لے۔ ہر فکر اس کی فکر میں ڈھل جائے اور ہر احساس و خیال اس کے ذکر و فکر اور اس کی رضا اور قرب کے حصول کی کوشش کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے۔ مخلوق سے انس کے بجائے اللہ سے انس پیدا ہو اور قبر کی وحشت میں جب کوئی اس کا غمخوار نہ ہوگا، یہ انس اس کا زادِ سفر بنے۔ یہ ہے اعتکاف کا مقصد، جو رمضان کے افضل ترین دنوں یعنی آخری عشرے کے ساتھ مخصوص ہے۔'' (زاد المعاد)

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اعتکاف کیا کرتے تھے اور آپؐ کے بعد آپ کی ازواجِ مطہراتؓ بھی اعتکاف کرتی رہیں۔

حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ حضرت نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہؓ نے مجھے مسجد کی وہ جگہ بھی دکھائی جہاں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف کیا کرتے تھے۔ (مسلم)

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اٹھالیا۔ پھر آپؐ کے بعد آپ کی بیویاں (بھی) اعتکاف کرتی تھیں۔ (بخاری)

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہر رمضان کو دس دن اعتکاف کیا کرتے تھے۔ پھر جب وہ سال آیا جس میں آپ کی وفات ہوئی تو آپؐ نے بیس دن اعتکاف کیا۔ (بخاری)

مسلمانوں نے ہر دور میں اور ہر جگہ اس سنت کو قائم رکھا اور آج تک یہ مبارک رسم جاری ہے کہ رمضان کے آخری عشرے میں عبادت سے محبت رکھنے والے لوگ مساجد میں اعتکاف کے لیے بیٹھ جاتے ہیں۔ دیندار خواتین میں سے بھی بہت سی ہیں جن میں اعتکاف کرنے کا ذوق وشوق پایا جاتا ہے مگر وہ مساجد کے بجائے اپنے گھروں ہی میں مناسب جگہ کا انتخاب کرکے گھر والوں سے ایک طرف ہو کر اعتکاف کے لیے بیٹھ جاتی ہیں۔

لیلۃ القدر: اس سلسلے کی آخری شے لیلۃ القدر ہے جسے عام طور پر شب قدر کہا جاتا ہے۔ یہ کوئی بڑی ہی برکت والی رات ہے جس کی فضیلت کی کوئی انتہا نہیں۔ کلام پاک میں اس کے متعلق فرمایا گیا ہے:

لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۙ سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝

(سورۃ القدر: ۳ تا ۵)

''شب قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔ فرشتے اور روح اس میں اپنے رب کے اذن سے ہر حکم لے کر اترتے ہیں۔ وہ رات سراسر سلامتی ہے طلوعِ فجر تک۔''

یہ جو فرمایا گیا ہے کہ شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ مفسرین نے بالعموم اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ اس رات کا عملِ خیر ہزار مہینوں کے عملِ خیر سے افضل ہے۔ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس رات کے عمل کی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے۔

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''(شب قدر کو) ڈھونڈو (یعنی ان راتوں میں عبادت کرو جن کے شب قدر ہونے کا احتمال ہو)'' (بخاری)

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جس نے ایمان کی حالت میں، ثواب کا کام جان کر شب قدر کو عبادت کی، اس کے گذشتہ گناہ معاف ہو گئے۔'' (بخاری)

لفظ ''قدر'' کے معنی بعض علماء نے تقدیر کے لیے ہیں یعنی یہ وہ رات ہے جس میں اللہ تعالیٰ تقدیر کے فیصلے نافذ کرنے کے لیے فرشتوں کے سپرد کر دیتا ہے اور بعض کا خیال ہے کہ قدر کے معنی عظمت و شرف کے ہیں یعنی یہ رات بڑی عظمت والی رات ہے۔

اس سورۃ میں فرشتوں کے ساتھ جو ''روح'' کا ذکر کیا گیا ہے تو روح سے مراد

حضرت جبرئیلؑ ہیں جن کے فضل وشرف کے باعث ان کا ذکر فرشتوں سے الگ کیا گیا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ یہ کون سی رات ہے تو حضورؐ نے کسی خاص رات کا تعین نہیں فرمایا۔ مگر جو روایات ملتی ہیں' ان کی بناء پر علماء فرماتے ہیں کہ یہ رمضان کے آخری عشرے کی کوئی طاق رات ہے۔ علمائے سلف کی بڑی تعداد ستائیسویں رات کو شب قدر سمجھتی ہے۔

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری دس دنوں میں اعتکاف کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ لیلۃ القدر کو رمضان کے آخری دس دنوں میں تلاش کرو۔ (بخاری)

حضرت عائشہؓ کا یہ بیان بھی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لیلۃ القدر کو رمضان کے آخری دس دنوں کی طاق (راتوں) میں تلاش کرو۔ (بخاری)

حضرت ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہؓ کو خواب میں لیلۃ القدر (رمضان کی) آخری سات راتوں میں دکھائی گئی تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے خواب آخری سات راتوں پر متفق ہو گئے ہیں۔ پس جس نے لیلۃ القدر کو تلاش کرنا ہو وہ اسے (رمضان کی) آخری سات راتوں میں تلاش کرے۔ (بخاری)

زِر بن جیش بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابیؓ بن کعبؓ سے عرض کیا کہ آپ کے بھائی حضرت ابن مسعودؓ تو کہتے ہیں کہ جو شخص سارا سال عبادت کرتا رہے وہ لیلۃ القدر کو پالے گا۔ اس پر حضرت اُبیؓ نے فرمایا کہ خدا ان پر رحم فرمائے۔ ایسا کہنے سے ان کی مراد یہ تھی کہ لوگ (کسی ایک دن ہی پر) بھروسہ نہ کر لیں (بلکہ زیادہ راتیں عبادت کریں) ورنہ وہ خوب جانتے تھے کہ لیلۃ القدر رمضان میں ہے اور آخری دس دن میں ہے

اور ستائیسویں کی رات ہے۔ پھر (حضرت ابی نے) قسم کھائی اور اس میں انشاء اللہ بھی نہ کہا کہ لیلۃ القدر ستائیسویں کی رات ہی ہے (زرّ کہتے ہیں کہ) میں نے عرض کیا کہ اے ابوالمنذر۔ آپ کس بناء پر ایسا کہتے ہیں۔ حضرت اُبیّ نے فرمایا کہ اس علامت یا نشانی کی بناء پر، جو ہمیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی تھی کہ اس (شب کے اگلے) دن (سورج) اس طرح طلوع ہوتا ہے کہ اس کی شعاعیں نہیں ہوتیں۔ (مسلم)

یہ روایات ہیں جو لیلۃ القدر کے بارے میں ملتی ہیں اور قطعی بات یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی معین رات کا پتہ نہیں دیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ خدا اور اس کے رسولؐ کی طرف سے کسی ایک رات کا تعین نہ کرنے میں غالباً یہ مصلحت ہوگی کہ لوگ لیلۃ القدر کی فضیلت سے فیض حاصل کرنے کے لیے زیادہ راتیں عبادت میں مصروف ہوں۔

ماحصل: ستون کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ چھت کو سہارا دیے رہے۔ نماز، زکوٰۃ، روزے اور حج بھی وہ ستون ہیں جو اسلامی زندگی کی عمارت کو سہارا دے کر اس کے قائم رہنے میں مددگار بنتے ہیں۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے، ایک خاص بات جو محسوس کی گئی ہے یہ ہے کہ یہاں اسلام کی عائد کردہ عبادتوں میں سے روزے پر عمل کرنے والے لوگ نسبتاً زیادہ پائے جاتے ہیں۔ زکوٰۃ اور حج کا تعلق تو ہوتا ہی صاحب استطاعت لوگوں سے ہے مگر نماز اور روزہ ایسی عبادتیں ہیں جو امیر غریب سب کے لیے ضروری ہیں۔ ان کے معاملے میں یہ دیکھا گیا ہے کہ نماز کو بلاناغہ اور باقاعدگی سے ادا کرنے والوں کی تعداد اتنی نہیں جتنی بلاناغہ روزہ رکھنے والوں کی ہے۔ کھیتوں میں کام کرنے والے کسان اور سڑکوں یا عمارتوں پر مشقت کرنے والے مزدور اتنی شدید جسمانی محنت کے باوجود روزے رکھتے ہیں۔ شہروں میں رہنے والے اور تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی پکے روزہ داروں کی تعداد پکے نمازیوں سے

زیادہ ہوتی ہے۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ موسم کی سختی اور خوشگواری کے لحاظ سے یہ تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی ہے' یعنی جب رمضان موسم سرما یا بہار وغیرہ میں آتا ہے تو زیادہ لوگ روزے رکھتے ہیں' مگر جب روزے شدید گرمی میں آئیں تو روزہ داروں کی تعداد نسبتاً کم ہو جاتی ہے۔ سوچا جائے تو ایسا ہونا بھی حقیقتِ دین سے ناواقفیت اور حبِ الٰہی اور خشیتِ الٰہی کی کمی ہی کے باعث ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر انسان کے دل و دماغ میں یہ بات اچھی طرح راسخ ہو کہ خدا کی راہ میں جتنی زیادہ تکلیف اٹھائی جائے گی' انشاءاللہ انجام کے زیادہ سے زیادہ بخیر ہونے کا باعث بنے گی' تو انسان تکلیف سے ڈر کر فرض سے منہ نہ موڑ لے۔

کسی عمل کا مشکل یا آسان ہونا بہت حد تک شوق کی کمی یا زیادتی پر منحصر ہوتا ہے' جس کام کے لیے دل میں ذوق و شوق زیادہ ہوگا۔ اس کی راہ کی مشکلات بھی آسان ہو جائیں گی اور جس کام کی طرف طبیعت کا میلان نہیں ہوگا' وہ فی نفسہٖ آسان بھی ہوگا تو مشکل لگے گا۔ بھوک پیاس کو برداشت کرنا' نیند کی خواہش کو روکنا اور دوسری بہت سی خواہشات اور جذبات پر قدغن لگانا آسان کام نہیں۔ تاہم یہ سب مشکل کام ان لوگوں کے لیے آسان ہیں جو:

اَلْخٰشِعِیْنَ ۙ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ۝

(البقرہ:۴۶)

(فرمانبردار ہیں' جو سمجھتے ہیں کہ آخر کار انہیں اپنے رب سے ملنا اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے)

یہاں ''عبادت'' کے اصلی مفہوم کو ذہن نشین کر لیجیے کہ عبد اپنے معبود کو خوش کرنے کے لیے جو کام بھی کرے' وہ عبادت ہے اور پھر غور کیجیے کہ روزہ عبد کو اس عبادت کے لیے کس طرح تیار کرتا ہے۔ رمضان کے پورے تیس یا انتیس دن انسان اس بات کی

مشق کرتا رہتا ہے کہ اپنے مالک وخالق کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جائز خواہشات کو بھی دبائے اور ہر سال کی یہ مشق اسے اس قابل بناتی چلی جاتی ہے کہ وہ زندگی کے ہر معاملے میں اپنی خواہشات و جذبات کی خوشنودی حاصل کرنے کے بجائے اپنے پروردگار کی خوشنودی حاصل کرنے میں مصروف رہے۔

حجِ بیت اللہ

لَبَّیْکَ o اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ o لَبَّیْکَ o لَاشَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ o اِنَّ اَلْحَمْدَ وَالنِّعْمَۃَ لَکَ وَالْمُلْکَ لَاشَرِیْکَ لَکَ۔

''میں تیرے حضور میں حاضر ہوں' اے اللہ میں تیرے حضور میں حاضر ہوں۔ میں تیرے حضور میں حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں' میں تیرے حضور میں حاضر ہوں۔ بے شک تعریف سب تیرے ہی لیے ہے اور نعمتیں سب تیری ہی دی ہوئی ہیں اور بادشاہی تیرا ہی حق ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔''

☆☆☆

اللہ کے خلیل

حضرت ابراہیم علیہ السلام

یہ آج سے کم و بیش چار ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ جس جگہ آج کل عراق آباد ہے، وہاں ایک ملک تھا جس کے پایہ تخت کا نام ''اُر'' تھا۔ اُر کی آبادی لاکھوں میں تھی اور یہ ایک بڑا تجارتی اور صنعتی مرکز تھا۔ اس کے تجارتی تعلقات دوسرے علاقوں سے بھی قائم تھے۔ یہاں کے باشندے زیادہ تر تاجر پیشہ یا صنعت پیشہ تھے۔ یہ بڑے کاروباری قسم کے مادہ پرست لوگ تھے۔ ان کی زندگی کا مقصد زیادہ تر یہی ہوتا تھا کہ دولت کمائیں اور دنیاوی عیش و آرام اور شان و شوکت کے سامان مہیا کریں۔

عقیدے کے لحاظ سے یہ لوگ مشرک تھے اور بت پوجتے تھے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس علاقے میں ہزاروں دیوی دیوتاؤں کی پوجا ہوتی تھی۔ ان لوگوں نے ان دیوتاؤں کے بت بنا رکھے تھے اور ان بتوں کے آگے وہ عبادت کی ساری رسوم ادا کرتے تھے۔ وہ ان دیوتاؤں سے دعائیں کرتے اور وہ دعائیں بھی زیادہ تر دنیاوی ساز و سامان کے حصول ہی کے لیے کی جاتی تھیں مثلاً عمر کی درازی، خوشحالی اور کاروبار کی ترقی کے لیے۔

ملک کے مختلف شہروں میں سے ہر شہر کا ایک خاص محافظ دیوتا ہوتا تھا۔ جس کا اس شہر میں دوسری دیوی دیوتاؤں سے زیادہ احترام کیا جاتا تھا۔ شہر اُر کے محافظ دیوتا کا نام ''نناز'' تھا۔ نناز کا بت اُر میں سب سے اونچی پہاڑی پر ایک عالی شان مندر میں نصب تھا۔

اس مندر کے لیے بے شمار باغات' مکانات اور زمینیں وقف تھیں اور اس لمبی چوڑی جائداد کے علاوہ وہاں کے تاجر لوگ ہر قسم کے غلے' دودھ' سونا' کپڑا اور دوسری چیزیں لالا کر مندر کی نذر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مندر کی طرف سے وسیع پیمانے پر تجارتی کاروبار بھی ہوتا تھا۔ یہ کام مندر کے پجاری دیوتا کے نائبوں کی حیثیت سے کرتے تھے۔

تتار کے مندر ہی میں ملک کی سب سے بڑی عدالت بھی تھی اور اس عدالت کے جج بھی مندر کے پجاری ہی ہوتے تھے۔ جو فیصلے یہ پجاری کرتے انہیں دیوتا کے فیصلے سمجھا جاتا۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ ملک کا اصلی حکمران تتار ہی ہے اور ملک کا بادشاہ تتار کے نائب کی حیثیت سے بادشاہی کرتا ہے۔ اس تعلق کے باعث وقت کا بادشاہ خود بھی خدا بن بیٹھتا تھا اور اس کی پوجا بھی اسی طرح ہوتی جس طرح دوسری معبودوں کی۔

معاشرتی طور پر اس علاقے کے باشندے تین طبقات میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک طبقہ اعلیٰ جس میں پجاری' سرکاری عہدیدار اور فوجی افسر شامل تھے۔ دوسرا طبقہ زیادہ تر صنعت پیشہ اور تجارت پیشہ لوگوں پر مشتمل تھا اور تیسرا طبقہ غلاموں کا تھا جن کا کام یہی تھا کہ خدمت کرتے رہیں۔ طبقہ اعلیٰ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو خصوصی اہمیت حاصل تھی اور انہیں بہت سے ایسے حقوق ملے ہوئے تھے جو دوسرے لوگوں کو حاصل نہیں تھے۔ یہاں تک کہ ان کے جان و مال کو دوسرے لوگوں کے جان و مال سے زیادہ قیمتی سمجھا جاتا تھا۔

مختصر یہ کہ یہ علاقہ شرک کا گڑھ تھا اور اس میں ''چھوٹے'' اور ''بڑے'' کے درمیان بہت فرق پایا جاتا ہے۔

یہ سرزمین تھی اور یہ لوگ تھے جن میں اللہ کے برگزیدہ نبی حضرت ابراہیم خلیل اللہ پیدا ہوئے۔ آپؑ کا زمانہ آج سے کم و بیش چار ہزار سال پہلے کا زمانہ تھا اور آپؑ کا باپ ملک کے طبقہ اعلیٰ سے تعلق رکھتا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ وہاں کا سب سے بڑا

عہد یدار تھا۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اس بگڑے ہوئے معاشرے کو درست کرنے کی بہت کوشش کی مگر ان ڈھیٹ لوگوں کی زندگی کے پورے نظام کی بنیاد بت پرستی پر تھی۔ ان کی تجارت' ان کی صنعت وحرفت' ان کی سیاست' ان کی گھریلو زندگی' ان کے اجتماعی معاملات' ہر جگہ بت پرستی کا دخل تھا۔ ان کے ''ایک خدا'' کو مان لینے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی معاشرت کے پورے ڈھانچے کو مسمار کر کے ایک نیا ڈھانچہ بناتے جو توحید پر مبنی ہوتا اور اس بات کے لیے وہ کسی صورت تیار نہ ہو سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کی تبلیغی کوششوں کی شدت سے مخالفت کی۔ کلام پاک میں سورہ مریم میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا ہے کہ کس طرح حضرت ابراہیمؑ نے اپنے مشرک باپ کو راہ راست دکھانے کی کوشش کی مگر اس بے نصیب پر کچھ اثر نہ ہوا۔

''اور (اے نبیؐ) اس کتاب میں ابراہیمؑ کا قصہ بیان کرو۔ بے شک وہ ایک راست باز انسان اور ایک نبی تھا (انہیں ذرا اس موقع کی یاد دلاؤ) جبکہ اس نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا جان' آپ کیوں ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کا کوئی کام بنا سکتی ہیں۔ ابا جان میرے پاس ایک ایسا علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا' آپ میرے پیچھے چلیں' میں آپ کو سیدھا راستہ بتاؤں گا۔ ابا جان' آپ شیطان کی بندگی نہ کریں' شیطان تو رحمٰن کا نافرمان ہے۔ ابا جان' مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ رحمٰن کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں اور شیطان کے ساتھی بن کر رہیں۔

(ابراہیمؑ کے اس سمجھانے بجھانے پر اثر لینے کے بجائے باپ الٹا غصے میں آ گیا اور) بولا کہ اے ابراہیمؑ' کیا تو میرے معبودوں سے پھر گیا ہے؟ (یاد رکھ کہ) اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا۔ بس تو ہمیشہ کے لیے مجھ سے الگ ہو جا۔'' (سورہ مریم: ۴۱ تا ۴۶)

کلام پاک ہی میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ کس طرح ایک دن حضرت ابراہیمؑ نے ان لوگوں کو یہ احساس دلانے کے لیے کہ بتوں کے پاس کسی قسم کی کوئی طاقت نہیں' ان کے بت کدے میں گھس کر بتوں کو توڑ پھوڑ ڈالا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اس سے بھی پہلے ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی ہوشمندی بخشی تھی اور ہم اس کو خوب جانتے تھے۔ یاد کرو وہ موقع جبکہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا کہ یہ مورتیں کیسی ہیں جن کے تم لوگ گرویدہ ہو رہے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے پایا ہے (اس پر) اس نے کہا کہ تم بھی گمراہ ہو اور تمہارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔ وہ کہنے لگے کہ کیا تم ہمارے سامنے اپنے اصلی خیالات پیش کر رہے ہو یا مذاق کرتے ہو۔ ابراہیمؑ نے جواب دیا کہ نہیں بلکہ فی الواقع تمہارا رب وہی ہے جو زمین اور آسمانوں کا رب اور ان کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس پر میں تمہارے سامنے گواہی دیتا ہوں اور خدا کی قسم' میں تمہاری غیر موجودگی میں ضرور تمہارے بتوں کی خبر لوں گا۔ چنانچہ اس نے (موقع پا کر) ان (بتوں) کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور صرف ان کے ایک بڑے (بت) کو چھوڑ دیا تا کہ وہ اس کی طرف رجوع کریں۔ (جب ان لوگوں نے آ کر اپنے بتوں کا یہ حال دیکھا تو) کہنے لگے کہ ہمارے خداؤں کا یہ حال کس نے کر دیا۔ بڑا ہی کوئی ظالم تھا وہ۔ (پھر بعض لوگ) بولے کہ ہم نے ایک نوجوان کو ان کا ذکر کرتے ہوئے سنا تھا جس کا نام ابراہیمؑ ہے (اس پر لوگ) کہنے لگے کہ پکڑ لاؤ اسے سب کے سامنے' تا کہ لوگ دیکھ لیں (کہ اس کی کیسی خبر لی جاتی ہے' پھر جب ابراہیمؑ لائے گئے تو) لوگوں نے پوچھا کہ اے ابراہیمؑ کیا تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟ ابراہیمؑ نے جواب دیا بلکہ یہ سب کچھ ان کے اس سردار نے کیا ہے۔ تم انہیں سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہیں۔ اس پر وہ لوگ اپنے جی میں سوچنے لگے۔ پھر (آپس میں ایک دوسرے

سے) کہنے لگے کہ حقیقت میں تم ہی لوگ ظالم ہو۔ مگر پھر ان کی مت پلٹ گئی اور (ابراہیمؑ سے مخاطب ہو کر) بولے کہ تو جانتا ہے کہ یہ (بت) بولتے نہیں ہیں۔ (اس پر) ابراہیمؑ نے کہا کہ پھر کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ان چیزوں کو پوج رہے ہو جو نہ تم کو نفع پہنچانے پر قادر ہیں نہ نقصان پہنچانے پر' تف ہے تم پر اور تمہارے ان معبودوں پر جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر پوجا کر رہے ہو۔ کیا تم کچھ بھی عقل نہیں رکھتے؟'' (سورۃ الانبیاء: ۵۱ تا ۶۷)

پھر کلام پاک ہی میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ کس طرح حضرت ابراہیمؑ کو علاقے کے حکمران نمرود کے سامنے پیش کیا گیا' جسے خدا ہونے کا دعویٰ تھا اور کس طرح حضرت ابراہیمؑ نے اس کے ساتھ مناظرہ کر کے اس کی زبان بند کر دی۔ سورۃ البقرہ آیت ۲۵۸ میں ارشاد ہوا ہے:

''(اے نبیؐ) کیا تم نے اس شخص (یعنی نمرود) کے حال پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیمؑ سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑا کیا؟ جھگڑا اس بناء پر کیا کہ اللہ نے اس شخص کو حکومت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیمؑ نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے تو اس نے جواب دیا کہ زندگی اور موت تو میرے اختیار میں ہے (اس پر) ابراہیمؑ نے کہا کہ اچھا' اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا اسے مغرب سے نکال لا۔ یہ سن کر وہ کافر ہکا بکا رہ گیا۔ مگر اللہ ظالموں کو راہ راست نہیں دکھایا کرتا۔''

اس ساری صورتِ حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان بت پرست لوگوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ حضرت ابراہیمؑ کو زندہ جلا دیا جائے۔ ان مشرکوں کے معاشرے میں خدائے واحد کی طرف بلانا اتنا بڑا جرم تھا کہ اس کے لیے یہی سزا مناسب سمجھی گئی۔ مگر اللہ رب العالمین نے اپنے خلیل کو جلتی آگ سے صاف بچا لیا۔ سورۃ الانبیاء' آیات ۶۸ تا ۷۰ میں فرمایا گیا ہے:

''انہوں نے کہا کہ جلا ڈالو اس کو (یعنی ابراہیمؑ کو) اور حمایت کرو اپنے خداؤں

کی اگر تمہیں کچھ کرنا ہے۔ ہم نے کہا' کہ اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیمؑ پر۔ وہ چاہتے تھے کہ ابراہیمؑ کے ساتھ برائی کریں' مگر ہم نے انہیں بری طرح ناکام کر دیا۔''

اتنا بڑا معجزہ دیکھ کر بھی وہ سخت دل لوگ راہ راست پر نہ آئے۔ لہٰذا حضرت ابراہیمؑ نے شرک کے اس گڑھ سے ہجرت اختیار کی اور شام و فلسطین کی طرف چل دیے جو ان دنوں ارض کنعان کہلاتی تھی۔ آپ پہلے حران (یا حاران) کے علاقے میں گئے اور وہاں سے فلسطین چلے گئے۔ آپؑ نے ''بیت ایل' حمرون اور بیر سبع کے علاقوں میں دین کی تبلیغ کے مرکز قائم کیے۔ اسی سلسلے میں آپؑ مصر بھی تشریف لے گئے اور حجاز بھی آتے جاتے رہے۔

جب حضرت ابراہیمؑ نے اُر سے ہجرت فرمائی تو آپؑ کے ساتھ آپؑ کے بھتیجے حضرت لوطؑ بھی تھے' جو آپؑ پر ایمان لائے تھے اور جنہیں بعد میں اللہ تعالیٰ نے اپنا نبی بھی بنا لیا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے دین کی تبلیغ کے لیے حضرت لوط کو بحر لوط کے مشرق میں ایک علاقے میں بٹھا دیا کہ وہ وہاں کے لوگوں کو خدائے واحد کے پیغام سنائیں۔ حجاز میں آپ نے خدا کا گھر تعمیر کیا اور وہاں اپنے بڑے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو معین کیا کہ وہ اس جگہ خدا کا دین پھیلائیں اور خود فلسطین میں حمرون کو اپنا ٹکانہ بنا لیا اور یہیں آپؑ کا انتقال ہوا۔

حضرت ابراہیمؑ کے بعد آپؑ کے دوسرے بیٹے حضرت اسحٰقؑ اس مرکز میں آپؑ کے جانشین ہوئے اور لوگوں کو خدا کے پیغام پہنچاتے رہے اور حضرت اسحٰقؑ کے بعد یہ میراث ان کے بیٹے حضرت یعقوبؑ کو پہنچی۔ حضرت ابراہیمؑ کے یہ دونوں صاحبزادے یعنی حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحٰقؑ اور آپؑ کے بھتیجے حضرت لوطؑ اور حضرت اسحٰقؑ کے صاحبزادے حضرت یعقوبؑ اور حضرت یعقوبؑ کے فرزند حضرت یوسفؑ ان سب کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کا شرف عطا فرمایا۔

حضرت ابراہیمؑ کا رتبہ بلند اور مقام عالی ان آیات سے واضح ہو جاتا ہے جو کلام پاک میں ان کے بارے میں نازل ہوئی ہیں:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۚ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ (مریم:۴۱)

''اور (اے نبیؐ) اس کتاب میں ابراہیمؑ کا قصہ بیان کریں۔ بے شک وہ ایک راست باز انسان اور ایک نبی تھے''

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ۝ (ھود : ۷۵)

''بے شک ابراہیمؑ بڑے حلیم، نرم دل اور ہر حال میں خدا کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔''

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ۝ (التوبۃ : ۱۱۴)

''بے شک ابراہیمؑ بڑے رقیق القلب، خدا ترس اور بردبار آدمی تھے۔''

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ (الممتحنہ : ۴)

''(مسلمانو) تم لوگوں کے لیے ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے۔''

عہد ابراہیمیؑ سے عہد نبویؐ تک

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی:

رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ "اے میرے رب، مجھے ایک بیٹا عطا کر جو صالحین میں سے ہو۔"

(الصفٰت: ۱۰۰)

اللہ تعالیٰ نے آپؑ کی یہ دعا قبول فرمائی۔ مگر جب یہ قبول ہوئی تو آپؑ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ روایت کیا جاتا ہے کہ جب آپؑ کے بڑے صاحبزادے حضرت اسمٰعیلؑ پیدا ہوئے تو آپؑ کی عمر اسی سال سے زیادہ ہو چکی تھی حضرت اسماعیلؑ حضرت ہاجرہ کے بطن سے تھے جو مصری تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی حضرت سارہ ابھی تک بے اولاد تھیں۔

مکہ: کلام پاک میں حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

"یاد کرو کہ جب ابراہیمؑ کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ ان سب میں پورا اتر گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔"

(سورۃ البقرہ: ۱۲۴)

جن "چند باتوں" کا یہاں ذکر ہے، یہ وہ آزمائشیں ہیں جن میں سے حضرت ابراہیمؑ کو حق کی راہ میں گزرنا پڑا اور جن میں وہ خدا کی مہربانی سے پورے اترے۔ ان

آزمائشوں میں سے ایک آزمائش یہ تھی کہ جو بچہ اتنی آرزوؤں اور تمناؤں کے بعد ملا تھا' اسے اور اس کی ماں کو عرب کے ایک لق و دق صحرا میں چھوڑ آنے کی ہدایت ہوئی اور حضرت ابراہیمؑ نے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے اس فرمان کی تعمیل کی۔ اس صحرا میں نہ پانی تھا نہ کھانے کے لیے کوئی شے' حضرت ابراہیمؑ نے چمڑے کا ایک تھیلا' جس میں کھجوریں تھیں اور پانی کا ایک مشکیزہ حضرت ہاجرہ کو دیا اور خود واپس آنے لگے۔ صحیح بخاری میں اس واقعے کے بارے میں ایک حدیث بیان ہوئی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ہاجرہ نے آپ سے دریافت فرمایا کہ کیا آپ کا ہمیں اس طرح اس سنسان بے آب و گیاہ وادی میں چھوڑ کر چلے جانا خدا کے حکم سے ہے تو آپؑ نے فرمایا کہ ہاں۔ اس پر وہ نیکوکار خاتون بولیں کہ اگر یہ بات ہے تو پھر خدا تعالیٰ ہمیں ضائع نہیں فرمائے گا' اور پھر وہ آکر بچے کے پاس بیٹھ گئیں۔

حضرت ہاجرہ بچے کو دودھ پلاتی رہیں اور مشکیزے کا پانی پیتی رہیں مگر جب پانی ختم ہو گیا تو پھر بہت پریشانی لاحق ہوئی۔ ماں بیٹوں کو پیاس لگ آئی اور پانی کہیں موجود نہ تھا۔ بچہ پیاس سے تڑپنے لگا۔ آخر حضرت ہاجرہ سے بچے کی حالت دیکھی نہ گئی اور وہ اٹھ کر وادی کی طرف یہ دیکھنے کے لیے چل پڑیں کہ کوئی آدمی نظر آئے یا کہیں پانی کا پتہ چلے مگر کوئی نظر نہ آیا۔ وہاں دو پہاڑیاں صفا اور مروہ تھیں جو ایک دوسری سے کچھ مسافت پر واقع تھیں۔ حضرت ہاجرہ نے پانی یا آدمی کی تلاش میں ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان سات چکر لگائے۔ ان نیک بی بی نے اپنی اس مصیبت کے وقت دونوں پہاڑیوں کے درمیان جو سات چکر لگائے تھے' اسی کی یاد میں اب ہر حاجی' جو بیت اللہ کا حج کرنے جاتا ہے' ان پہاڑیوں کے درمیان سات پھیرے کرتا ہے۔

آخر اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئی اور اس بے آب و گیاہ وادی میں پانی کا

ایک چشمہ پھوٹ پڑا۔ یہ وہی چشمہ ہے جسے ہم "زمزم" کہتے ہیں۔ زمزم کے پھوٹ نکلنے سے حضرت ہاجرہ کی ایک بہت بڑی تکلیف رفع ہوگئی۔ آپ زمزم کا پانی پیتی رہیں اور بچے کو دودھ پلاتی رہیں۔ کچھ مدت اس طرح گزری تھی کہ خدا کی مہربانی سے وہاں انسان بھی آ گئے۔ عرب کے جنوب کا ایک قبیلہ' جس کا نام "بنو جرھم" تھا۔ صحرا میں سفر کرتے ہوئے اس جگہ سے کچھ فاصلے پر ٹھہرا' جہاں حضرت ہاجرہ بچے کو لے کر بیٹھی تھیں۔ ان میں سے کچھ لوگ پانی کی تلاش میں ادھر آ نکلے۔ جب انہوں نے پانی دیکھا تو انہوں نے حضرت ہاجرہ سے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم یہاں ٹھہر جائیں۔ حضرت ہاجرہ نے اجازت دے دی تو قبیلہ بنو جرھم نے وہاں رہنا شروع کر دیا اور ان لوگوں نے دیکھا کہ حضرت ہاجرہ بہت ملنسار تھیں۔

اس طرح اس لق ودق' سنسان وادی میں اللہ کی مہربانی سے پہلے دو انسان آئے' پھر پانی آیا' پھر ایک قبیلے کا قبیلہ آ کر وہاں سکونت پذیر ہو گیا۔ لہٰذا آہستہ آہستہ اس جگہ نے ایک بستی کی شکل اختیار کر لی۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا یہ بستی ترقی کرتی گئی' یہاں تک کہ وہ ایک شہر بن گئی اور یہی بستی اب "مکہ مکرمہ" کہلاتی ہے۔

حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ اسی وادی میں زندگی گزارتے رہے اور حضرت اسمٰعیلؑ بنو جرہم ہی کے درمیان پلے بڑھے اور ان لوگوں سے انہوں نے عربی زبان بھی سیکھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی وقتاً فوقتاً بیوی اور بچے کو دیکھنے کے لیے یہاں آتے رہے۔

قربانی: جب حضرت اسمٰعیلؑ کی عمر اندازاً تیرہ برس کی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ایک اور معاملے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش فرمائی اور حضرت ابرہیمؑ اس آزمائش میں بھی پورے اترے۔

حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنے بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں۔ چونکہ انبیاء کے خواب سچے ہوتے ہیں' اس لیے اس خواب کا مطلب یہی تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کو اللہ کی راہ میں اپنے اکلوتے بیٹے کو قربانی کر دینے کا حکم صادر فرمایا جا رہا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اس خواب کا ذکر حضرت اسمٰعیلؑ سے کیا تو انہوں نے بھی اس خواب کا یہی مفہوم لیا کہ اللہ تعالیٰ قربانی کا حکم دے رہے ہیں۔ لہٰذا وہ بے تکلف بولے۔

يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (الصّٰفّٰت : ۱۰۲)

''اباجان' جو کچھ آپؑ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالیے۔ آپ انشاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔''

یہ واقعہ دس ذوالحجہ کا ہے اور مکہ مکرمہ میں پیش آیا تھا مگر بیٹے کو قربان کرنے کے لیے حضرت ابرہیمؑ انہیں مکے سے باہر منیٰ کے مقام پر لے گئے جو مکہ مکرمہ سے کچھ میل دور ہے۔ پھر آپؑ نے بیٹے کو پیشانی کے بل زمین پر ڈال دیا اور اسے خدا کی راہ میں قربان کرنے کو تیار ہو گئے' مگر قبل اس کے کہ حضرت اسمٰعیلؑ ذبح ہوتے' خدا کی طرف سے ندا آئی۔

اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا. (الصفت:۱۰۴'۱۰۵)

''اے ابراہیمؑ' تو نے خواب سچ کر دکھایا۔''

پھر اللہ تعالیٰ کے فرشتے نے خدا کے حکم سے ایک مینڈھا حاضر کیا حضرت اسمٰعیلؑ کی جگہ اس کو قربان کر دیا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیلؑ کی جان بخشی فرما دی اور ان کی جگہ مینڈھا ذبح کر دیا گیا۔

یہ آزمائش جو حضرت ابراہیمؑ کو پیش آئی اتنی بڑی تھی کہ انسانی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے۔ اللہ رب العلمین نے خود بھی یہی فرمایا۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ○ ''یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی۔''

(الصفت:۱۰۶)

جب حضرت ابراہیمؑ اس آزمائش میں بھی پورے اترے تو اللہ رب العٰلمین نے اس واقعے کو یادگار بنا دیا اور آج تک اس بے مثال قربانی کی یاد میں دس ذوالحجہ کو قربانی دی جاتی ہے اور قیامت تک دی جاتی رہے گی۔

بنائے خانہ کعبہ: وقت گزرتا رہا اور حضرت اسمٰعیلؑ اسی بستی میں بنو جرہم کے درمیان پلتے بڑھتے رہے۔ جب وہ جوان ہوئے تو ان کے بہترین اخلاق اور عمدہ اوصاف کے باعث بنو جرہم نے خود خواہش ظاہر کی کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی شادی ان کے قبیلے میں ہو۔ پہلے حضرت اسمٰعیلؑ کی شادی ان کی ایک لڑکی سے ہوئی۔ یہ لڑکی حضرت ابراہیمؑ کو پسند نہ آئی تو پھر حضرت اسمٰعیلؑ نے اسے چھوڑ دیا اور ایک دوسری لڑکی سے شادی کی جسے حضرت ابراہیمؑ نے پسند فرمایا۔ اس دوران میں حضرت ہاجرہ وفات پا گئیں۔ حضرت اسمٰعیلؑ کو اللہ تعالیٰ نے بارہ بیٹے عطا فرمائے۔

جب حضرت اسمٰعیلؑ کی عمر اندازاً تیس برس کی تھی تو اس کام کا وقت آ گیا جس کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے ان لوگوں کو اس مقام پر چھوڑا تھا۔

ایک دن حضرت اسمٰعیلؑ زمزم کے پاس بیٹھے تیر بنا رہے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ وہاں تشریف لے آئے اور فرمایا کہ اسمٰعیلؑ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک کام کرنے کا حکم دیا ہے انہوں نے عرض کیا کہ آپ کے رب نے جس کام کا حکم دیا ہے آپ اسے ضرور کریں۔ حضرت ابراہیمؑ نے پوچھا کہ تم اس میں میری مدد کرو گے۔ انہوں نے کہا کہ جی ہاں، میں آپؑ کی مدد کروں گا۔ اس پر حضرت ابراہیمؑ نے وادی کے ایک حصے کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ اللہ نے مجھے یہاں ایک گھر بنانے کا حکم دیا ہے۔

چنانچہ دونوں باپ بیٹوں نے مل کر خانہ کعبہ بنانا شروع کر دیا۔ حضرت اسمٰعیلؑ پتھر لاتے تھے اور حضرت ابراہیمؑ انہیں نصب کرتے جاتے تھے جب دیواریں کافی بلند ہو گئیں تو حضرت اسمٰعیلؑ وہ پتھر اٹھا لائے جو ''مقام ابراہیمؑ'' کے نام سے مشہور ہے اور حضرت ابراہیمؑ نے اس پر کھڑے ہو کر پتھر نصب کرنے شروع کر دیے اور دیواروں کو اور زیادہ بلند کیا۔ جب دونوں باپ بیٹا خانہ کعبہ کو تعمیر کر رہے تھے تو ساتھ دعائیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ سورۃ البقرہ آیات ۱۲۷ تا ۱۲۹ میں فرمایا گیا ہے:

''یاد کرو کہ جب ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے (تو دعا کرتے جاتے تھے کہ) اے ہمارے رب، ہم سے یہ خدمت قبول فرما لے۔ یقیناً تو بڑا سننے والا بہت جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب، ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیع فرمان) بنا اور ہماری نسل میں سے ایک ایسی قوم اٹھا، جو تیری مطیع فرمان ہو اور ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہماری توبہ قبول فرما۔ بے شک تو بڑا توبہ قبول کرنے والا، رحم فرمانے والا ہے۔ اے ہمارے رب، ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک رسول اٹھائیو جو انہیں تیری آیات سنائے اور انہیں کتاب اور دانائی کی باتوں کی تعلیم دے اور انہیں پاک کرے، بے شک تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے۔''

کلام پاک میں خانہ کعبہ کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ.....	''بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ، جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔''
(آل عمرٰن: ۹۲)	

جب اسلام آیا تو ساری مکی زندگی اور ہجرت کے سولہ مہینے بعد تک مسلمان بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے یعنی ان کا قبلہ بیت المقدس رہا، مگر پھر اللہ تعالیٰ

نے خانہ کعبہ کو قبلہ بنا دیا۔ بیت المقدس چونکہ یہودیوں کا قبلہ تھا اس لیے جب مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں بیت المقدس کو چھوڑ کر خانہ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا شروع کی تو یہودیوں نے بہت اعتراضات کیے اور باتیں بنائیں۔ اس آیت میں خانہ کعبہ کی فضیلت بیان کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ وہ پہلی عبادت گاہ ہے جو لوگوں کے لیے بنائی گئی تھی۔ بیت المقدس کے متعلق معلوم ہے کہ اسے حضرت سلیمانؑ نے تعمیر کیا تھا اور انہیں کے زمانے میں اسے اہلِ توحید کا قبلہ قرار دیا گیا تھا۔ حضرت سلیمانؑ کا زمانہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے سے ساڑھے چار سو سال بعد کا بتایا جاتا ہے اور خانہ کعبہ کو حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کیا جو حضرت موسیٰؑ سے آٹھ نو سو برس پہلے گزرے تھے۔ اس لحاظ سے خانہ کعبہ بیت المقدس سے کم و بیش تیرہ چودہ سو سال پہلے تعمیر ہوا تھا۔

پھر جب خانہ کعبہ تیار ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے حج کا نظام شروع کیا گیا۔ کلام پاک میں سورۃ الحج میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

"وہ وقت یاد کرو جب ہم نے ابراہیمؑ کے لیے اس گھر (یعنی خانہ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی (اس ہدایت کے ساتھ) کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو کہ وہ تمہارے پاس ہر دور دراز مقام سے پیدل اور دبلی اونٹنیوں پر سوار آئیں تاکہ وہ ان فائدوں کو دیکھیں جو یہاں ان کے لیے رکھے گئے ہیں اور چند مقرر دنوں میں ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انہیں بخشے ہیں۔ پھر اس میں سے خود بھی کھائیں اور تنگدست محتاج کو بھی کھلائیں پھر اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں اور اس قدیم گھر کا طواف کریں۔ یہ تھا (تعمیر کعبہ کا مقصد) اور جو کوئی اللہ کی قائم کردہ حرمتوں کا احترام کرے تو یہ اس کے رب کے نزدیک خود

اسی کے لیے بہتر ہے۔" (الحج:۲۶ تا ۳۰)

اسی طرح پھر حضرت ابراہیمؑ نے حج کا نظام شروع کیا جو اس وقت سے لے کر آج تک قائم ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے زمانے سے ایک مدت کے بعد جب عرب میں بہت خرابیاں پھیل گئیں اور ہر طرف بت پوجے جانے لگے تو لوگوں نے حج کی اصلی رسوم میں بھی تبدیلیاں کر دیں۔ یہاں تک کہ خانہ کعبہ میں بت بھی لا کر رکھ دیے۔ مگر جب جناب رسول خدا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ آیا اور آپؐ نے مکہ فتح کر لیا تو خانہ کعبہ کو بتوں سے پاک کر دیا اور حج کی رسوم کو از سر نو اسی طرح جاری کر دیا گیا جیسے کہ وہ پہلے تھیں۔

بعد کا زمانہ: جب تک حضرت اسمٰعیلؑ زندہ رہے آپؑ ہی کعبے کے متولی رہے مگر جب آپؑ نے وفات پائی تو آپؑ کے بڑے بیٹے "نابت" متولی بنے' لیکن نابت کی وفات کے بعد کعبے کی تولیت حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد سے نکل گئی اور بنو جرہم' جو حضرت ہاجرہ کے زمانے سے مکے میں آباد تھے' کعبے کے متولی بن گئے۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ بنو جرہم میں بہت خرابیاں پیدا ہو گئیں اور وہ بددیانتی پر اتر آئے۔ خانہ کعبہ میں جو مال ہدیے کے طور دیا جاتا تھا' اس میں انہوں نے خیانت شروع کر دی' اور جو لوگ اللہ کے گھر کی زیارت کو آتے انہیں بھی ستانے اور تنگ کرنے لگے۔

آخر جب ان کی زیادتیاں حد سے بڑھ گئیں تو بعض دوسرے قبیلوں نے ان سے جنگ کر کے انہیں مکہ مکرمہ سے نکال دیا۔ جاتے جاتے بھی یہ لوگ شرارت کر گئے۔ وہ یہ کہ کعبے کا خزانہ زمزم میں ڈال دیا اور زمزم کو بند کر کے اس کا نشان تک مٹا گئے۔

بنو جرہم کے بعد قبیلہ بنو خزاعہ خانہ کعبہ کا متولی بن گیا اور تین چار سو برس تک کعبے کی تولیت انہیں کے قبضے میں رہی۔ اس دوران میں خانہ کعبہ کو پورا بت خانہ بنا دیا گیا۔ اس

کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ بنوخزاعہ کا سردار عمرو بن لُحی بہت زیادہ ہر دلعزیز تھا اور لوگ اس کی ہر اچھی بری بات کو بے چوں و چرا مانتے تھے۔ ایک دفعہ وہ شام کی طرف گیا اور وہاں لوگوں کو بتوں کی پرستش کرتے دیکھا۔ اسے یہ شے بہت پسند آئی۔ وہ وہاں سے ایک بت لے آیا' جس کا نام ''ہبل'' تھا اور لا کر اسے کعبے میں نصب کر دیا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ اور بت بھی آتے گئے اور خانہ کعبہ بت کدہ بن گیا۔ انہیں بتوں میں حضرت ابراہیمؑ' حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت مریمؑ کے بت بھی شامل تھے۔

قریش: بنوخزاعہ کے بعد کعبے کی تولیت قریش کے ہاتھ آ گئی۔ یہ اس طرح ہوا کہ قبیلہ قریش کے قابل جوان قصیٰ بن کلاب نے خزاعی امیر کی بیٹی سے شادی کی اور اس کے بعد قریشی داماد نے خزاعی خسر سے کعبے کی تولیت لے لی۔ یہ قصی بن کلاب ہی تھے جن کی نسل میں آئندہ چل کر جناب رسول مقبول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ قصی کے بیٹے عبد مناف تھے' عبد مناف کے بیٹے ہاشم' ہاشم کے بیٹے عبدالمطلب' عبدالمطلب کے بیٹے عبداللہ اور عبداللہ کے فرزند ارجمند حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کعبے کے متولی بن جانے کے باعث قبیلہ قریش کی عزت بہت بڑھ گئی تھی۔ عرب کے سب قبائل ان کا احترام کرتے تھے کیونکہ خانہ کعبہ کو سارے عرب میں مرکزی حیثیت حاصل تھی اور بت پرست ہونے کے باوجود حج کے دنوں میں عرب کے ہر کونے سے لوگ یہاں حج کرنے آیا کرتے تھے۔ تمام قبائل قریش کو خانہ کعبہ کے خادم سمجھتے ہوئے ان کا اتنا لحاظ کرتے تھے کہ جب ان کے تجارتی قافلے گزرتے تو ان پر حملے کرنے سے پرہیز کی جاتی' اور راستے کے قبائل ان سے وہ بھاری ٹیکس بھی وصول نہ کر سکتے جن کا دوسرے قافلوں سے مطالبہ کیا جاتا تھا۔

عہد نبویؐ: جب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے تو عرب میں ہر طرف

بت پرستی پھیلی ہوئی تھی اور یہی حال قریش کا تھا۔ حج کی رسوم بھی، جیسے کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، اپنی اصلی شکل پر قائم نہیں رہی تھیں بلکہ ان میں بہت کچھ تبدیلیاں کر دی گئی تھیں۔ عرب لوگ خدا کی ہستی کو تو مانتے تھے اور یہ بھی مانتے تھے کہ خانہ کعبہ خدا کا گھر ہے اور اس بات معترف تھے کہ زمین آسمان خدا ہی نے بنائے ہیں مگر وہ خدا کی خدائی میں دوسروں کو شریک کرتے تھے۔ اسی کا نام "شرک" ہے۔ اس شرک کا نتیجہ یہ تھا کہ خانہ کعبہ کو خدا کا گھر مانتے ہوئے بھی انہوں نے اندر بے شمار بت رکھے ہوئے تھے۔

منصب نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ برس تک ان لوگوں پر تبلیغ کرتے رہے مگر کچھ لوگوں کے سوا باقی سب مشرک اپنے شرک پر اڑے رہے اور حضورؐ اور حضورؐ پر ایمان لانے والے مسلمانوں کو بہت تکلیفیں پہنچائیں۔ آخر اللہ پاک کے حکم سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور اکثر مسلمان ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے۔ ہجرت کے بعد اسلام زیادہ تیزی سے پھیلنے لگا اور شہر مدینہ نے ایک چھوٹی سی آزاد اسلامی ریاست کی شکل اختیار کر لی۔ مکہ مکرمہ پر اب بھی کافروں ہی کا قبضہ تھا۔

ہجرت کے آٹھویں سال حضورؐ نے مکہ مکرمہ پر حملہ کر دیا۔ یہ وقت آنے تک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اتنی طاقت عطا کر دی تھی اور مکے کے کافر ان کے مقابلے میں اتنے کمزور ہو چکے تھے کہ حضورؐ نے آسانی سے مکے پر قبضہ کر لیا۔ جب آپ مکہ مکرمہ پر قابض ہو گئے تو آپؐ نے خانہ کعبہ سے تمام بتوں کو نکال کر خانہ کعبہ کو ان گندگیوں سے پاک کر دیا۔

اب اگرچہ حضورؐ مکہ فتح کر چکے تھے تاہم ۸ھ کا حج مشرکوں ہی کے اہتمام سے ہوا۔ پھر اگلے سال 9ھ میں حضورؐ نے مسلمانوں کا ایک قافلہ حج کے لیے روانہ فرمایا۔ اس قافلے کے امیر الحج حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے۔ یہ پہلا سال تھا کہ حج ٹھیک سنتِ ابراہیمیؑ کے مطابق ادا کیا گیا، اور مشرکین نے حج کی رسوم میں جو خرابیاں پیدا کر دی تھیں،

ان کا قلع قمع کر دیا گیا۔ اسی حج کے دوران یہ اعلان بھی کر دیا گیا کہ آئندہ سے کوئی مشرک خانہ کعبہ میں داخل نہیں ہو سکے گا۔

اس کے بعد جب اگلا سال یعنی ۱۰ھ آیا تو حضورؐ مسلمانوں کے ایک جم غفیر کے ساتھ خود حج کرنے تشریف لائے۔ اس حج کو حجۃ الوداع کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے بعد پھر حضورؐ کی زندگی میں دوسرے حج کی نوبت نہ آئی اور ۱۱ھ میں حضورؐ اپنے رفیقِ اعلیٰ کے پاس واپس تشریف لے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ ہے حج کی تاریخ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کے ساتھ مل کر عرب میں خدا کی عبادت کے لیے ایک گھر بنایا اور اسے اہلِ ایمان کا مرکز قرار دے کر اس کا حج کرنے کا حکم دیا۔ اس حکم پر کم و بیش چار ہزار سال سے عمل ہو رہا ہے اور انشاء اللہ قیامت تک ہوتا رہے گا' کیونکہ حضرت ابراہیمؑ سے کم و بیش ڈھائی ہزار برس بعد جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی کی حیثیت سے تشریف لائے تو اہلِ ایمان کے لیے جو چار عبادتیں آپؐ نے فرض قرار دیں' ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ہر صاحب استطاعت مسلمان زندگی میں ایک بار حج ضرور کرے۔

حج کی تاکید اور فضیلت

لغت میں حج کا مطلب ''قصد کرنا'' ہے اور شریعت میں حج یہ ہے کہ معین مخصوص آداب وضوابط کے ساتھ خانہ کعبہ کی زیارت کی جائے۔ حج زندگی میں صرف ایک دفعہ فرض ہے۔ زکوٰۃ کی طرح حج بھی ہر مسلمان پر فرض نہیں ہوتا بلکہ صرف ان مسلمانوں پر فرض ہے جو حج کرنے کی استطاعت رکھتے ہوں۔ علمائے کرام نے قرآن وحدیث کی روشنی میں تفصیل سے معین کر دیا ہے کہ انسان کو کیا کچھ حاصل ہو تو سمجھا جائے گا کہ اب اسے حج کرنے کی استطاعت حاصل ہے۔

مثال کے طور پر حج اس پر فرض ہوگا جو

۱۔ مسلمان ہو' کافر پر حج فرض نہیں۔

۲۔ بالغ ہو' بچے پر فرض نہیں۔

۳۔ اس کے حواس درست ہوں' پاگل' مجنون وغیرہ پر حج فرض نہیں۔

۴۔ جسمانی صحت اس قابل ہو کر حج کا سفر کر سکے۔ یعنی کوئی ایسی بیماری نہ ہو کہ حج کا سفر ممکن نہ ہو۔ ایسے انسان کے لیے خود حج کرنا ضروری نہیں ہوگا۔ البتہ اگر اس میں باقی شرائط پائی جائیں تو وہ کسی دوسرے سے حج کرا سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ دوسرا شخص خود اپنا حج کر چکا ہو۔

۵۔ آزادی حاصل ہو یعنی غلام اور کنیز پر حج فرض نہیں۔

۶۔ کسی ظالم یا جابر حکمران کی طرف سے جان کا خوف نہ ہو اور آدمی کسی کی قید و بند میں بھی نہ ہو۔

۷۔ جن راہوں سے گزر کر جانا ہو وہ پر امن ہوں۔

۸۔ مالی حالت اس قابل ہو کہ اپنے حج کے اخراجات بھی پورے کر سکے اور جن لوگوں کا نان و نفقہ اس کے ذمہ ہے انہیں اپنی غیر موجودگی کے دوران کا خرچ بھی دے سکے۔

۹۔ خواتین کے لیے اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ان کے ساتھ ان کا کوئی محرم بھی ہو یعنی کوئی ایسا رشتے دار مرد جس کے ساتھ نکاح ناجائز ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب جس انسان کے حالات ایسے ہوں کہ وہ ان تمام شرائط کو پورا کرتا ہو مگر اس کے باوجود حج کو نہ جائے تو وہ اسلامی شریعت کی رو سے گنہگار ہے۔

سخت افسوس کا مقام ہے کہ مسلمانوں میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جو ہر طرح کی استطاعت رکھنے کے باوجود حج کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ عوام میں یہ خیال بھی پھیلا ہوا ہے کہ جس کے گھر میں جوان بچیاں ہوں، وہ جب تک بچیوں کی شادیاں نہ کر لیں انہیں حج کرنا جائز نہیں۔ حالانکہ حج کی شرائط میں یہ کہیں نہیں ہے کہ جوان بچیوں کی موجودگی میں حج نہیں ہو سکتا۔ اگر خدا نے کسی کو اتنی مالی استطاعت دے رکھی ہے کہ وہ بچیوں کی شادیاں بھی کر سکتا ہے اور حج بھی، اور اس کی غیر موجودگی میں بچیوں کی حفاظت کا بندوبست بھی ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ صرف اس لیے حج نہ کرے کہ ابھی بچیوں کی شادیاں نہیں ہوئیں۔ بچیوں کی شادیاں تو بعض اوقات مناسب رشتے نہ ملنے کے باعث بھی لیٹ ہو سکتی ہیں تو حج کیوں خواہ مخواہ لٹکائے رکھا جائے۔

حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

کہ ''جس نے حج کا ارادہ کیا ہو اسے جلدی کرنا چاہیے۔'' (ابوداؤد)

فضیلت: حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ جس نے خدا کے لیے حج کیا اور (اس کے دوران) نہ کوئی فحش بات کی اور نہ کسی گناہ کا مرتکب ہوا تو وہ اس طرح (گناہوں سے پاک صاف ہو کر) لوٹے گا جیسا وہ اس دن تھا جب اس کی ماں نے اسے جنم دیا تھا۔ (بخاری)

حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''حج اور عمرے کو یکے بعد دیگرے کرتے رہو (یعنی حج کے بعد عمرہ اور عمرے کے بعد حج) کیونکہ حج اور عمرے کا یکے بعد دیگرے کرتے رہنا مفلسی اور گناہوں کو اس طرح دور کرتا ہے جیسے بھٹی لوہے کے میل کچیل کو دور کر دیتی ہے۔'' (ابن ماجہ)

کلام پاک میں ایک آیت ہے:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدہ:۳)

''آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔''

اس آیت کے بارے میں ایک یہودی نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ اگر یہ آیت ہم پر اترتی تو ہم اس دن کو عید کا دن بنا لیتے۔ اس پر حضرت عمر نے فرمایا:

''میں اس دن کو جانتا ہوں جس دن یہ آیت نازل ہوئی تھی اور اس کے نزول کی رات کو بھی جانتا ہوں۔ وہ جمعے کی رات تھی اور ہم (حج کے لیے) رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میدان عرفات میں تھے۔'' (نسائی)

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ

کون سا عمل افضل ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لانا۔ پوچھا گیا' اس کے بعد کون سا افضل ہے۔ فرمایا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔ پوچھا گیا کہ اس کے بعد کون سا ہے۔ فرمایا کہ وہ حج جس کے دوران گناہ نہ کیا گیا ہو۔ (بخاری)

حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص عرفات میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھڑا تھا۔ اچانک وہ اپنی سواری سے گر پڑا اور سواری نے اس کی گردن توڑ دی' تو حضورؐ نے فرمایا کہ اس کو پانی اور بیری (کے پتوں) سے غسل دو اور اسے دو کپڑوں کا کفن دو اور اس کو خوشبو نہ لگاؤ' نہ اس کا سر ڈھانپو اور نہ اسے حنوط ملو۔ قیامت کے دن خدا اسے لبیک کہتا اٹھائے گا۔ (بخاری)

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "خدا کے مہمان تین ہیں: اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا' حج کرنے والا اور عمرہ کرنے والا۔" (نسائی)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اے خدا کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم جہاد کو سب سے افضل عمل سمجھتی ہیں' تو کیا ہم جہاد نہ کریں؟ حضورؐ نے فرمایا کہ (تمہارے کیے) سب سے افضل جہاد وہ حج ہے جس کے دوران گناہ نہ کیا جائے۔ (بخاری)

مقاماتِ حج

حج کی تاکید اور فضیلت سمجھ لینے کے بعد یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ حج کرنے کا پورا طریقہ بھی واضح ہو جائے۔ کیونکہ جن لوگوں نے حج نہ کیا ہو ان میں سے غالب اکثریت کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ حج کس طرح کیا جاتا ہے۔ حج کے علاوہ باقی تین عبادتیں یعنی نماز، روزہ اور زکوٰۃ تو اسلامی معاشرے میں ہر جگہ ادا کی جاتی ہیں۔ اس لیے جو لوگ ان کے پابند نہیں ہوتے، وہ بھی اتنا تو جانتے ہی ہیں کہ نماز کی شکل و صورت کیا ہے، روزے کیسے رکھے جاتے ہیں اور زکوٰۃ کس عمل کا نام ہے، مگر حج کی عبادت چونکہ دنیا میں صرف ایک ہی علاقے میں ادا کی جاتی ہے۔ اس لیے اسے صرف وہی دیکھ سکتے ہیں جو وہاں موجود ہوں۔ لہٰذا اکثریت نہیں جانتی کہ حج کس طرح کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ حج کوئی ایسی عبادت نہیں جو کسی ایک جگہ بیٹھ کر تھوڑی دیر میں کر لی جائے بلکہ اس کے لیے چار مختلف مقامات پر پھرنا ہوتا ہے اور اس کی رسوم ادا کرنے میں کم و بیش پانچ چھ دن صرف ہوتے ہیں۔ یہ رسوم اسلامی سال کے آخری مہینے ذوالحجہ کی آٹھویں تاریخ سے لے کر بارہویں یا تیرہویں تاریخ تک ادا کی جاتی رہتی ہیں۔ ان رسوم کو ''مناسکِ حج'' کہا جاتا ہے اور جن مقامات پر یہ رسوم ادا کی جاتی ہیں، وہ ''مقاماتِ حج'' کہلاتے ہیں۔ یہاں پہلے ''مقاماتِ حج'' کو بیان کیا جاتا ہے اور اس کے بعد پھر ''مناسکِ حج'' کی وضاحت کی جائے گی۔

''مقاماتِ حج'' حسب ذیل ہیں:

۱۔ مکہ مکرّمہ میں خانہ کعبہ اور اس کے اردگرد کا کچھ حصہ۔

۲۔ منیٰ کا میدان۔

۳۔ مزدلفہ کا میدان۔

۴۔ عرفات کا میدان۔

اب سب سے پہلے مکہ مکرمہ کو لیجئے۔

مکہ مکرّمہ اور حدودِ حرم: یہ مبارک شہر بہت زیادہ فضیلت کا حامل ہے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ اس کا آغاز اُن تین پاک روحوں سے ہوا' جن میں سے دو خدا کے نبی تھے اور تیسری ایک نیک بخت' نیکوکار' صابر و شاکر خاتون تھیں جو ایک نبی کی بیوی اور دوسرے نبی کی ماں تھیں۔ پھر یہی وہ متبرک بستی تھی جس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے سب سے پہلا گھر تعمیر کیا گیا۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ. (اٰل عمرٰن : ۹۶)	''بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔''

اور یہی خوش بخت علاقہ تھا جسے اڑھائی ہزار سال بعد خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مولد بننے کا شرف حاصل ہوا۔ کلام پاک نے اس بابرکت شہر کو

اَلْبَلَدِ الْاَمِیْن	امن والا شہر
اور اُمُّ الْقُرٰی	بستیوں کا مرکز

کے خطابات عطا فرمائے ہیں اور اسے ''حرم'' قرار دیا ہے۔ حرم کا مطلب ہے قابلِ احترام علاقہ۔ حرم میں نہ صرف مکے کا شہر ہی ہے بلکہ اس کی ہر ہر سمت میں کئی کئی کلومیٹر کے علاقے

کو حرم کی حدود میں داخل کر دیا گیا ہے یہ سارا علاقہ ''حرم'' کہلاتا ہے اور اس کی عظمت و احترام کے کچھ آداب و احکام مقرر فرما دیے گئے ہیں۔ یعنی ان حدود میں بہت سے وہ کام ناجائز ہیں جو ان حدود سے باہر جائز ہیں مثلاً حرم کی حدود میں

☆ جنگ نہیں کی جا سکتی'

☆ شکار کو قتل نہیں کیا جا سکتا'

☆ خودرو گھاس' پودے' پیڑ وغیرہ کاٹے اور اکھاڑے نہیں جا سکتے۔ وغیرہ وغیرہ

☆ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا تو دن کے کچھ حصے کے لیے آپ کو خصوصی رعایت کے طور پر یہ اجازت ملی کہ آپؐ وہاں جنگ کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد پھر وہ حرمت دوبارہ قائم ہو گئی اور اب قیامت تک قائم رہے گی۔

امیر معاویہؓ کے زمانے میں ان کی طرف سے ایک شخص سعید بن عمرو مدینے کا والی تھا۔ ایک دفعہ اس نے مکے کی طرف فوج روانہ کرنا چاہی تو ایک صحابی حضرت ابوشریح عدویؓ اس کے پاس گئے اور فرمایا:

''.....اے امیر' مجھے اجازت دیں کہ میں آپؐ کو وہ بات بتاؤں جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دوسرے دن فرمائی تھی۔ اس بات کو میرے دونوں کانوں نے سنا اور میرے دل نے اسے یاد رکھا اور جب حضورؐ یہ بات فرما رہے تھے تو میری دونوں آنکھیں آپ کو دیکھ رہی تھیں۔ آپ نے (پہلے) اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور پھر فرمایا کہ بے شک مکے کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے اور لوگوں نے اسے حرام نہیں کیا۔ پس جو شخص بھی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ اس میں خون بہائے یا یہاں کا درخت کاٹے' اور اگر کوئی شخص خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگ کے باعث اس کی اجازت سمجھے تو اسے بتا دو کہ اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اجازت دی

تھی مگر تم لوگوں کو نہیں دی اور مجھے بھی اس نے اجازت دن کے تھوڑے سے حصے ہی کے لیے دی تھی۔ آج اس کی حرمت پھر اسی طرح لوٹ آئی ہے جیسے کل تھی اور (یہ ارشاد فرما کر آپؐ نے پھر یہ بھی فرمایا کہ) جو شخص (اس وقت) حاضر ہے (اور اس نے یہ بات سنی ہے) اسے چاہیے کہ یہ بات اس شخص کو بتا دے جو (اس وقت) حاضر نہیں ہے۔ (بخاری)

ایسے ہی حضرت ابن عباسؓ نے بھی روایت کیا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بے شک اللہ نے مکے کو حرام (یعنی محترم) قرار دیا ہے۔ مجھ سے پہلے یہ کسی کے لیے حلال نہیں ہوا اور نہ میرے بعد کسی کے لیے حلال ہوگا اور میرے لیے بھی یہ صرف دن کی ایک ساعت کے لیے حلال ہوا تھا (اس کے بعد اس کی حرمت پھر قائم ہوگئی' پس) یہاں کی گھاس نہ اکھاڑی جائے اور یہاں کا درخت نہ کاٹا جائے اور یہاں کا شکار نہ بھگایا جائے اور یہاں کی گری پڑی چیز نہ اٹھائی جائے۔ ہاں معرّف کو اجازت ہے۔ (بخاری)

معرّف وہ شخص ہوتا ہے جو گری پڑی چیز اٹھا کر اعلان کرتا ہے کہ جس کی چیز ہے وہ آ کر لے لے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص یہاں کی گری پڑی چیز اس خیال سے اٹھائے کہ اعلان کر کے چیز کے مالک کو چیز پہنچاؤں تو چیز کو اٹھانا جائز ہے ورنہ نہیں۔ کلامِ پاک میں بیان ہوا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ مکرمہ کے لیے دعا کی تھی کہ:

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ.....

"اے میرے رب' اس شہر کو امن کا شہر بنا دے اور اس کے باشندوں کو پھلوں سے رزق عطا فرما....." (البقرہ : ۱۲۶)

اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں دعائیں قبول فرمائیں۔ مکہ مکرمہ اب بھی ایک ایسی وادی ہے جہاں ہر طرف خشک جلے ہوئے پہاڑ ہی نظر آتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے ایسا بندوبست فرمایا ہوا ہے کہ دنیا جہان کی نعمتیں وہاں کھنچی چلی آتی ہیں اور جہاں تک اس کے

امن وامان کا تعلق ہے اگر کوئی شخص حدودِ حرم سے باہر کسی جرم کا ارتکاب کر کے بھی حرم کے اندر آجائے تو جب تک وہ حرم کے اندر ہے اس سے قصاص نہیں لیا جا سکتا۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی حرم کی حرمت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''حرم کے باہر کسی شخص نے کسی کو قتل کیا ہو یا کوئی اور ایسا جرم کیا ہو، جس پر حد (یعنی شرعی سزا) لازم آتی ہو تو جب تک وہ وہاں رہے اس پر ہاتھ نہ ڈالا جائے گا۔ حرم کی یہ حیثیت حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے چلی آتی ہے اور فتح مکہ کے روز صرف ایک ساعت کے لیے اٹھائی گئی۔ پھر ہمیشہ کے لیے قائم ہوگئی۔ قرآن کا ارشاد ہے۔ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (جو اس میں داخل ہو گیا وہ امن میں آ گیا) حضرت عمرؓ، عبداللہؓ بن عمرؓ اور عبداللہؓ بن عباسؓ کے یہ اقوال معتبر روایات میں آئے ہیں کہ اگر ہم اپنے باپ کے قاتل کو بھی وہاں پائیں تو اسے ہاتھ نہ لگائیں..... حرم میں جنگ اور خونریزی حرام ہے..... وہاں کے قدرتی درختوں کو نہیں کاٹا جا سکتا، نہ خود رو گھاس اکھاڑی جا سکتی ہے، نہ پرندوں اور دوسرے جانوروں کا شکار کیا جا سکتا ہے اور نہ شکار کیا جائے..... وہاں کی گری پڑی چیز اٹھانا ممنوع ہے۔ جیسا کہ ابوداؤد میں آیا ہے کہ اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہ علیہ وسلّم نَھَی عَنْ لُقْطَةِ الْحَاجِّ یعنی حضورؐ نے حاجیوں کی گری پڑی چیز اٹھانے سے منع فرما دیا تھا۔''

(تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۲۱۹، ۲۱۸)

احادیث سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حرم میں ایک گھاس اگتی تھی جسے ''اذخر'' کہا جاتا تھا، اسے کاٹنے کی حضورؐ نے اجازت دے دی تھی کیونکہ اسے وہاں کے سنار استعمال کرتے تھے اور قبروں کے کام آتی تھی۔ ایسے ہی جانوروں میں سے سانپ، بچھو اور بعض دوسرے موذی جانوروں کو مارنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

اہلِ مکہ کو یہ متبرک شہر اتنا عزیز تھا کہ ہجرت کے بعد جب مسلمانوں نے مدینہ

منورہ رہنا شروع کر دیا تو وہ تڑپ تڑپ کر مکے کو یاد کیا کرتے تھے۔ جب مہاجرین مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہاں کی آب و ہوا انہیں راس نہ آئی اور متعدد بزرگ بخار میں مبتلا ہو گئے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے موذن حضرت بلالؓ کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ بیماری کی حالت میں آپؓ کو وطن کی یاد بے طرح ستاتی تو آپؓ مکہ مکرمہ کی وادیوں، چشموں، پہاڑوں بلکہ وہاں اگنے والی گھاس تک کو یاد کرتے اور شدتِ غم میں ذیل کے حسرت ناک شعر پڑھتے۔

''کاش میں ایک رات اس میدان میں بسر کرتا جہاں میرے اردگرد ''اذخر'' اور ''جلیل'' ہوتیں!

کیا میں پھر کسی دن ''کوہِ مجنہ'' کے چشموں سے سیراب ہوں گا؟

کیا میرے سامنے پھر ''شامہ'' اور ''طفیل'' ہوں گی؟''

واضح رہے کہ ''اذخر'' اور ''جلیل'' گھاس کی دو قسمیں تھیں جو مکے میں اگتی تھیں اور ''شامہ'' اور ''طفیل'' مکے کی دو پہاڑیوں کے نام تھے۔

خود حضورؐ مکے کو بے انتہا عزیز رکھتے تھے۔

حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ ''تو کس قدر پاک اور پاکیزہ شہر ہے اور مجھے کس قدر محبوب ہے۔ اگر میری قوم مجھے تجھ سے نکال نہ دیتی تو میں تیرے سوا کہیں اور نہ بستا۔'' (ترمذی)

مسجد حرام: مکہ مکرمہ میں ایک بہت بڑی مسجد ہے جسے ''مسجد حرام'' کہا جاتا ہے۔ ''مسجد حرام'' کا مطلب ہے ''قابل احترام مسجد'' یا ''حرمت والی مسجد۔'' مسجد حرام دنیا کی تمام مساجد میں افضل مسجد ہے۔ ابن ماجہ میں ایک حدیث ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس مسجد میں ایک نماز پڑھنے کا اجر و ثواب کسی دوسری جگہ ایک لاکھ نمازیں پڑھنے

کے ثواب کے برابر ہے۔

ام المومنین حضرت میمونہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ میری اس مسجد میں (یعنی مدینہ منورہ کی مسجد نبویؐ میں) ایک نماز پڑھنا کسی دوسری جگہ ہزار نمازیں پڑھنے سے افضل ہے سوائے کعبے کی مسجد کے۔ (نسائی)

''کعبے کی مسجد'' سے مراد یہی مکہ مکرمہ کی ''مسجد حرام'' ہے۔ حضورؐ کے فرمان کا مطلب یہ ہے کہ مسجد حرام کی نماز مسجد نبویؐ کی نماز سے بھی زیادہ افضل ہے اور آپؐ نے ''مسجد حرام'' کو ''کعبے کی مسجد'' اس لیے فرمایا کہ اسی پاک مسجد کے صحن میں خانہ کعبہ واقع ہے۔ خانہ کعبہ کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے یہ مفید ہوگا کہ آگے آنے والے خاکے کو ساتھ ساتھ دیکھا جاتا رہے۔

<u>خانہ کعبہ</u>: خانہ کعبہ ایک مربع عمارت ہے جو پتھر کی بنی ہوئی ہے' اور ساری عمارت پر سیاہ رنگ کا خوبصورت غلاف چڑھا ہوا ہے۔ یہ غلاف ہر سال بدلا جاتا ہے۔ خانہ کعبہ کی سطح زمین سے کافی اونچی ہے' اتنی کہ خانہ کعبہ کے دروازے تک پہنچنے کے لیے سیڑھی استعمال کی جاتی ہے۔ خانہ کعبہ کا ایک ہی دروازہ ہے جو عمارت کی مشرقی دیوار میں بنا ہوا ہے' جیسے کہ خاکے سے نظر آ رہا ہے۔ دروازہ مشرقی دیوار کے وسط میں نہیں بلکہ خانہ کے جنوب مشرقی کونے سے کچھ فٹ پہلے بنا ہوا ہے۔ یہ دروازہ اکثر بند رہتا ہے اور کبھی کبھی ہی کھولا جاتا ہے۔ جب یہ کھولا جاتا ہے' تو لوگ اندر جا سکتے ہیں۔ اندر ستون ہیں جن پر خانہ کعبہ کی چھت قائم ہے۔ جب خانہ کعبہ کے اندر نماز پڑھی جائے گی تو وہاں کسی خاص سمت کی طرف منہ کرنا ضروری نہیں۔ بلکہ جس طرف جی چاہے منہ کر لیا جائے کیونکہ جس طرف بھی رخ کیا جائے گا سامنے کعبے ہی کی کوئی دیوار ہوگی۔ احادیث سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حضورؐ نے خانہ کعبہ کے اندر نماز ادا کی تھی۔

حضرت سالم اپنے والد (حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ) کے بارے میں بتاتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت اسامہؓ بن زیدؓ اور حضرت بلالؓ اور حضرت عثمانؓ بن طلحہ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے اور دروازہ بند کر لیا۔ پھر جب انہوں نے دروازہ کھولا تو میں پہلا تھا جو اندر داخل ہوا اور بلالؓ مجھے ملے تو میں نے ان سے پوچھا کہ کیا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اندر نماز ادا کی ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ ہاں۔ ان دونوں یمنی ستونوں کے درمیان نماز ادا کی ہے۔ (بخاری)

حضرت نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ جب کعبے میں داخل ہوتے تو سامنے چلتے اور دروازے کی طرف ان کی پشت ہوتی اور وہ چلتے رہتے' یہاں تک کہ ان کے اور ان کے سامنے والی دیوار کے درمیان تقریباً تین گز کا فاصلہ رہ جاتا۔ پھر نماز پڑھتے اور اس جگہ کا قصد کرتے جس کے متعلق (انہیں) حضرت بلالؓ نے بتایا تھا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ نماز پڑھی تھی (یہ بات بیان کر کے حضرت نافع نے فرمایا کہ) کسی شخص پر کچھ حرج نہیں کہ خانہ کعبہ میں جس سمت بھی چاہے نماز پڑھ لے۔ (بخاری)

حجرِ اسود: خانہ کعبہ کے دروازے کی دائیں جانب عمارت کے جنوب مشرقی کونے میں حجرِ اسود نصب ہے۔ ''حجر'' کا مطلب ہے پتھر اور ''اسود'' کالے کو کہتے ہیں۔ لہٰذا ''حجرِ اسود'' کا مطلب ہے کالا پتھر جب حاجی طواف کرتا ہے تو اس پتھر کو چوم کر یہیں سے طواف شروع کرتا ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حجرِ اسود جنت کا پتھر ہے۔ (نسائی)

حضرت سوید بن غفلہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حجرِ اسود کو بوسہ دیا اور اس سے چمٹ گئے اور فرمایا کہ میں نے ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھ پر مہربان دیکھا۔ (نسائی)

''ابوالقاسم'' رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیت تھی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے لے کر آج تک خانہ کعبہ کئی دفعہ از سرنو بنایا گیا ہے اور حضرت ابراہیمؑ کے زمانے کا ایک بھی پتھر اس میں باقی نہیں مگر حجر اسود کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ یہ چار ہزار سال سے سلامت چلا آرہا ہے۔ اسے بوسہ دیتے وقت جب دل میں یہ خیال آتا ہے کہ یہ پتھر اتنے لمبے عرصے سے سلامت چلا آرہا ہے۔ اس پر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیل کے ہاتھ پڑے تھے' اسے حضورؐ کے مقدس لبوں نے چھوا تھا اور صحابہ کرامؓ اور اکابر اسلام سب اسے بوسہ دیتے چلے آرہے ہیں اور آج ہم گنہگار بھی خدا کے فضل سے اس قابل ہو گئے ہیں کہ اسے بوسہ دیں' تو دل کی عجب کیفیت ہو جاتی ہے۔

ملتزم: خانہ کعبہ کے دروازے اور حجر اسود کے درمیان اندازاً چھ فٹ جگہ ہے جسے ملتزم کہا جاتا ہے۔ اب خاکے سے ملتزم کو دیکھ لیجئے۔ ملتزم کا مطلب ہے ''چمٹنے کی جگہ''۔ جس طرح حجر اسود کو بوسہ دیا جاتا ہے اسی طرح ملتزم سے چمٹ کر اور اپنا چہرہ اس سے لگا کر نہایت عاجزی اور انکساری سے دعا مانگی جاتی ہے۔ جن مقامات پر دعا خاص طور پر قبول ہوتی ہے ان میں ایک مقام یہ ملتزم بھی ہے۔ جب طواف ختم کر لیا جاتا ہے' تو پھر اس جگہ چمٹ کر دعا کی جاتی ہے۔

رکنِ یمانی: خانہ کعبہ کے ایک کونے میں تو حجرِ اسود نصب ہے اور باقی تین کونوں کے علیحدہ علیحدہ نام ہیں۔ مشرقی دیوار کے شمال مشرقی کونے کو ''رکنِ عراقی'' کہا جاتا ہے' پھر شمالی دیوار ختم ہو کر جو شمال مغربی کونہ آتا ہے' اس کا نام ''رکنِ شامی'' ہے۔ پھر مغربی دیوار ختم ہو کر جو جنوب مغربی کونہ آتا ہے اسے ''رکنِ یمانی'' کہا جاتا ہے۔ خانہ کعبہ کا یہ کونہ بھی

بہت متبرک ہے۔ طواف کرتے ہوئے اسے چھونا مستحب ہے۔ رکن یمانی کو چھونے کو بھی ''استلام'' کہا جاتا ہے۔ استلام کا مطلب بوسہ دینا بھی ہے اور چھونا بھی۔ حجرِ اسود کا استلام یہ ہے کہ اسے بوسہ دیا جائے اور رکن یمانی کا استلام یہ ہے کہ اسے چھوا جائے۔

ذیل کے خاکے کو دیکھنے سے یہ بات زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آجائے گی کہ خانہ کعبہ کے چاروں کونے' دروازہ' ملتزم اور حجر اسود کہاں کہاں ہیں۔

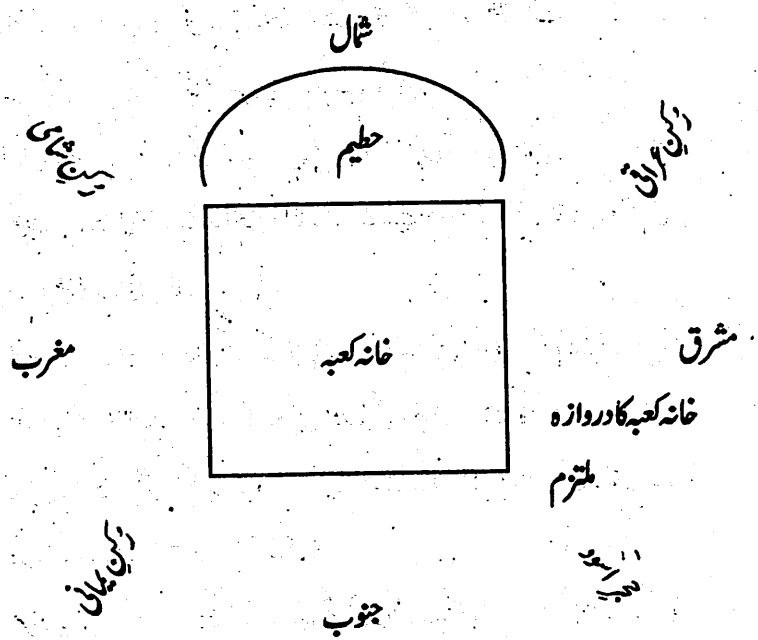

حطیم: مندرجہ بالا خاکے پر نگاہ ڈالنے سے آپ کو یہ بھی نظر آئے گا کہ خانہ کعبہ کی شمالی دیوار کے ساتھ ایک نصف دائرہ بنا ہوا ہے۔ یہ کچھ زمین ہے جس کے گرد نصف دائرے کی شکل میں دیوار بنی ہوئی ہے۔ اس جگہ کو حطیم کہا جاتا ہے اور اس میں نماز پڑھنے کا اتنا ہی ثواب ہے جتنا کعبے کے اندر نماز پڑھنے کا۔ یہ اس لیے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ

تو درحقیقت وہ اسی پکار کا جواب دیتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی اقرار کرتا ہے کہ خدا واحد ہے' اس کا کوئی شریک نہیں' تعریف سب اسی کے لیے ہے' نعمتیں سب اسی کی عطا کی ہوئی ہیں اور اقتدار صرف اسی کے ہاتھ میں ہے۔

احرام باندھنے کے بعد ایک دفعہ تلبیہ پڑھنا فرض ہے۔ ویسے احرام باندھنے سے لے کر دسویں تاریخ کو پہلے جمرے کو کنکر مارنے تک برابر تلبیے کا ورد رکھنا چاہیے۔ ہر نشیب میں اترتے وقت' ہر بلندی پر چڑھتے وقت' ہر قافلے سے ملتے وقت' ہر نماز سے فارغ ہونے کے بعد اور ہر صبح و شام تلبیہ پڑھنا چاہیے۔ تلبیہ پڑھتے وقت آواز کو بلند رکھا جائے مگر خواتین کے لیے مسنون یہی ہے کہ تلبیہ پڑھنے میں اپنی آواز بلند نہ کریں۔

تلبیہ پڑھنے کی فضیلت کا اندازہ لگانے کے لیے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذیل کی حدیث دیکھ لینا کافی ہوگا۔

حضرت سہلؓ بن سعد بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی مسلمان تلبیہ کہتا ہے تو اس کے دائیں اور بائیں جانب جتنے پتھر اور درخت اور ڈھیلے ہوتے ہیں (وہ سب بھی) تلبیہ کہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ادھر بھی اور ادھر بھی زمین کے انتہائی کناروں تک ایسے ہی ہوتا ہے۔ (ترمذی)

مراد یہ ہے کہ تلبیہ پڑھنے والے کے مشرق کی طرف بھی اور مغرب کی طرف بھی زمین کے آخری کناروں تک جتنے درخت' پتھر اور ڈھیلے ہوتے ہیں۔ وہ سب بھی تلبیہ پڑھتے ہیں۔

حالتِ احرام کی پابندیاں: حج کی نیت کرنے' احرام باندھنے اور تلبیہ کرنے سے اب حج کا ارادہ کرنے والا پورے طور پر حج میں داخل ہو گیا۔ شریعت کی اصطلاح میں اب وہ ''حالتِ احرام'' میں ہے۔

حجاج بن یوسف نے حطیم کے حصے کو پھر باہر نکال دیا۔ پھر اس زمانے سے لے کر آج تک خانہ کعبہ کی شکل مربع ہی ہے اور حطیم والی زمین خانہ کعبہ سے باہر ہی ہے۔ ایک روایت کے مطابق خلیفہ ہارون الرشید نے اپنے عہد میں فقیہہ مدینہ امام مالک سے دریافت کیا تھا کہ کیا میں خانہ کعبہ کو پھر اسی طرح نہ بنا دوں جیسے حضرت ابن زبیرؓ نے بنایا تھا' تو امام مالکؒ نے فرمایا کہ اے امیر المومنین' میں آپ کو قسم دیتا ہوں کہ خانہ کعبہ کو بادشاہوں کا کھلونا نہ بنایئے--- امام مالکؒ نے حطیم کو اندر داخل کرنے کی اجازت اس لیے نہ دی کہ کہیں ایسے نہ ہو کہ کوئی اور حکمران آ کر پھر اسے باہر نکال دے اور اس طرح آئے دن کعبے کی شکل بدلتی ہی رہے' کبھی مربع اور کبھی مستطیل۔ لہٰذا حجاج بن یوسف کے زمانے سے لے کر آج تک کعبے کی وہی مربع شکل چلی آ رہی ہے اور حضورؐ کے زمانے میں بھی اس کی یہی شکل تھی۔ حضورؐ نے یہ بتانے کے علاوہ کہ حطیم کعبے کے اندر داخل تھی' اس بات کی بھی وضاحت فرما دی کہ کعبے سے باہر ہونے کے باوجود حطیم میں نماز پڑھنے کا اتنا ہی ثواب ہے جتنا کعبے کے اندر نماز پڑھنے کا۔

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ میں خانہ کعبہ کے اندر جا کر نماز پڑھنا چاہتی تھی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے حجر میں داخل کر دیا اور فرمایا کہ جب تو خانہ کعبہ میں داخل ہونا چاہے تو حجر میں نماز پڑھ لے کیونکہ یہ خانہ کعبہ ہی کا ایک حصہ ہے۔ تیری قوم (قریش) نے جب خانہ کعبہ کو بنایا تو انہوں نے اسے بنانے میں کوتاہی کی اور اس حصے کو خانہ کعبہ سے باہر نکال دیا۔ (ابوداؤد)

واضح رہے کہ "حجر" حضورؐ نے اسی جگہ کو کہا جسے "حطیم" کہا جاتا ہے۔

چونکہ حطیم خانہ کعبہ کا حصہ ہے اس لیے جب خانہ کعبہ کا طواف کیا جاتا ہے تو حطیم کی دیوار سے باہر طواف ہوتا ہے تاکہ حطیم کا بھی طواف ہو جائے۔

میزاب رحمت: ''میزاب'' پرنالے کو کہتے ہیں۔ خانہ کعبہ کی شمالی دیوار میں ایک پرنالہ بنا ہے جس کا پانی حطیم میں گرتا ہے۔ اس پرنالے کو ''میزاب رحمت'' کہا جاتا ہے۔ یعنی ''رحمت کا پرنالہ''۔ میزاب رحمت کی دیوار چار انگل بلند ہے۔ یہ ایک ہاتھ چوڑا اور دو ہاتھ دیوار سے باہر نکلا ہوا ہے۔ یہ بھی دعا کی قبولیت کے مقامات میں سے ایک مقام ہے۔

کلام پاک میں اللہ تعالیٰ نے حاجیوں کے بارے میں فرمایا ہے:

وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ. (الحج: ۲۹) ''اور انہیں چاہیے کہ اس قدیم گھر طواف کریں۔''

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے سید ابوالاعلیٰ مودودی فرماتے ہیں:

''کعبے کے لیے ''بیت عتیق'' کا لفظ بہت پر معنی ہے۔ ''عتیق'' عربی زبان میں تین معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ایک قدیم،

دوسرے آزاد، جس پر کسی کی ملکیت نہ ہو،

اور تیسرے مکرم و معزز۔

یہ تینوں معنی اس پاک گھر پر صادق آتے ہیں۔''

(تفہیم القرآن، جلد سوم، صفحہ ۲۲۱)

کلام پاک میں خانہ کعبہ کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ. (آل عمران: ۹۶) (اس کو خیر و برکت دی گئی اور اسے تمام جہان والوں کے لیے ہدایت کا منبع بنایا گیا ہے)

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے دو دفعہ خانہ کعبہ کو ''بیتی'' کہا ہے یعنی میرا گھر۔ ایک دفعہ سورۃ البقرہ آیت ۱۲۵ میں۔

اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعَاكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ. (اور پاک رکھو میرے اس گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے)

اور دوسری دفعہ سورہ الحج آیت ۲۶ میں۔

وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ. (اور میرے گھر کو پاک رکھو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے)

مطاف: خانہ کعبہ کے چاروں طرف کنارے کنارے ایک راستہ بنا ہوا ہے جس میں حطیم بھی داخل ہے۔ یہ ایک قسم کی سڑک سی ہے جس نے خانہ کعبہ اور حطیم کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا ہے۔ یہاں طواف کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کا نام "مطاف" ہے۔ مطاف کا مطلب ہے طواف کرنے کی جگہ۔ نماز کی جماعت کے علاوہ دن ہو یا رات ہر وقت یہاں لوگ طواف کرتے نظر آتے ہیں۔

مقام ابراہیمؑ: اوپر گزر چکا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیلؑ خانہ کعبہ کی تعمیر میں مصروف تھے تو حضرت اسمٰعیلؑ پتھر لا رہے تھے اور حضرت ابراہیمؑ انہیں نصب کر رہے تھے۔ جب دیواریں بلند ہو گئیں تو حضرت اسمٰعیلؑ ایک پتھر اٹھا کر لائے اور حضرت ابراہیمؑ نے اس پتھر پر کھڑے ہو کر دیواروں کو مزید بلند کیا۔ اس پتھر کا نام "مقام ابراہیمؑ" ہے۔ یہ مبارک پتھر ابھی تک موجود ہے اور مسجد حرام میں خانہ کعبہ سے شمال مشرق کی طرف خانہ کعبہ کے دروازے سے کچھ فاصلے پر حفاظت سے رکھا ہوا ہے۔ طواف کرنے والا ہر شخص اپنا طواف پورا کر کے مقامِ ابراہیمؑ کے پاس آ کر دو نفل ادا کرتا ہے۔

زمزم: زمزم کے جاری ہونے کا ذکر اوپر گزر چکا ہے کہ جب حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیلؑ پیاس سے بیتاب ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اس صحرا میں یہ چشمہ پیدا کر دیا۔ زمزم انسانوں کو پانی بہم پہنچاتا رہا' یہاں تک کہ کئی صدیوں کے بعد جب بنو جرہم کو مکہ مکرمہ سے بھاگنا پڑا تو وہ جاتے جاتے زمزم کو بند کر کے اس کا نشان تک مٹا گئے۔ پھر صدیوں تک زمزم بند رہا یہاں تک کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کا زمانہ آ گیا اور ان کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے پھر زمزم کو جاری فرما دیا۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی جناب عبدالمطلب کے اوصاف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ فخر بھی جناب عبدالمطلب ہی کو حاصل ہوا کہ زمزم جسے بنو جرہم بند کر کے اس کا نشان تک مٹا گئے تھے' ان کے ہاتھوں برآمد ہوا۔ محمد بن اسحٰق نے حضرت علیؓ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ خواب میں جناب عبدالمطلب کو زمزم کا مقام بتایا گیا اور انہیں ہدایت کی گئی کہ اس جگہ کو کھود کر یہ مقدس کنواں برآمد کر لیں۔ اس وقت ان کا کوئی بیٹا حارث کے سوا نہ تھا۔ اسی کو لے کر وہ کدال پھاوڑا لیے ہوئے وہاں پہنچے اور کھدائی شروع کر دی۔ جب پانی برآمد ہوا تو عبدالمطلب نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ اس سے قریش کے لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ زمزم نکل آیا ہے۔" (سیرت سرور دو عالمؐ جلد ۲ صفحہ ۸۷)

اس وقت سے لے کر آج تک یہ مبارک چشمہ جاری ہے اور انشاء اللہ قیامت تک جاری رہے گا۔ یہ نہ خشک ہوتا ہے نہ اس میں کمی آتی ہے' ہزارہا سال سے یہ سارے عالم اسلام کو سیراب کر رہا ہے اور بقول مولانا ابوالحسن ندوی۔

"اس میں خدا نے شفا بھی رکھی ہے' غذائیت بھی' اجر بھی اور برکت بھی۔"

صفا مروہ: صفا اور مروہ کا ذکر اوپر گزر چکا ہے کہ یہ دو پہاڑیاں تھیں اور حضرت ہاجرہ نے پانی کی تلاش میں ان کے درمیان سات چکر لگائے تھے جس کی یاد میں اب ہر حاجی ان کے

درمیان چکر لگاتا ہے۔ اس عمل کو ''سعی'' کہا جاتا ہے اور دونوں پہاڑیوں کے درمیان والے راستے کو ''مسعیٰ'' کہتے ہیں جس کا مطلب ہے وہ جگہ جہاں سعی کی جاتی ہے۔ یہ پہاڑیاں تو اب موجود نہیں' ہاں مسعیٰ کے دونوں کناروں پر ان کے کچھ نشانات موجود ہیں' اور اس سارے راستے پر خوبصورت دو منزلہ عمارت بنا دی گئی ہے جو ایک پہاڑی سے لے کر دوسری پہاڑی تک مسلسل چلتی ہے۔ صفا خانہ کعبہ سے کچھ فاصلے پر اس کے جنوب میں واقع ہے اور ''مروہ'' اس کے بالمقابل خانہ کعبہ کے شمال میں ہے۔

یہ تو وہ مقامات تھے جو مکہ مکرمہ سے تعلق رکھتے ہیں مگر حج کرنے کے لیے مکے کے علاوہ تین اور مقامات پر جانا ہوتا ہے جن میں پہلا مقام ''منیٰ'' ہے۔

منیٰ: منیٰ مکہ مکرمہ سے اندازاً پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ حاجی میدان عرفان کی طرف جاتے ہوئے ایک دن اور وہاں سے واپس آ کر تین یا چار دن یہاں قیام کرتے ہیں۔ یہاں تین ستون بنے ہوئے ہیں جن میں سے ہر ایک دوسرے سے کچھ مسافت پر واقع ہے۔ ان ستونوں کو ''جمرات'' کہا جاتا ہے۔

روایت بیان ہوئی ہے کہ جب حضرات ابراہیم علیہ السلام بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنے کے لیے لے کر چلے تو یہ وہ مقامات تھے جہاں شیطان نے آپؑ کو ورغلانے کی کوشش کی تھی۔ آپؑ اس کے بہکانے میں نہ آئے اور اظہارِ لعنت کے طور پر اس پر کنکر پھینکے۔ ان تینوں مقامات پر نشان کے طور پر ستون بنا دیے گئے ہیں' اور اس واقعے کی یاد میں اب ہر حاجی ان جمرات کو کنکر مار کر گویا اس عزم کا اظہار کرتا ہے کہ جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے شیطان کو نامراد کیا تھا اور اس پر لعنت کی تھی اسی طرح ہم بھی اس کے کہے میں نہیں آئیں گے' ہم اس پر لعنت کرتے ہیں۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ جمرات کو کنکر مارنے اس واقعے کی یادگار ہے کہ جس

سال رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی تھی اسی سال ایک عیسائی حکمران ''ابرہہ'' نے ایک زبردست فوج کے ساتھ مکہ مکرمہ پر حملہ کیا تھا تاکہ خانہ کعبہ کو مسمار کر دے۔ مکے کے قریب ایک وادی ہے جسے ''وادی مُحَسِّر'' کہا جاتا ہے۔ جب ابرہہ کی فوج یہاں پہنچی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کی حفاظت کے لیے غیبی بندوبست فرمایا۔ سمندر کی جانب سے چھوٹے چھوٹے پرندوں کے جھنڈ پَرے کے پَرے بن کر نمودار ہوئے۔ ان کے پنجوں اور چونچوں میں ننھی ننھی کنکریاں تھیں۔ وہ انہوں نے ابرہہ کی فوج پر گرائیں تو فوج تباہ و برباد ہو کر رہ گئی۔ اس فوج میں ہاتھی بھی تھے جو اہلِ مکہ کے لیے بڑی غیر مانوس شے تھے۔ اس واقعے کے باعث اہلِ عرب نے اس سال کا نام ''عام الفیل'' رکھ دیا یعنی ''ہاتھی کا سال۔''

حاجیوں کا جمرات کو کنکریاں مارنا چاہے پہلے واقعے کی یادگار ہو چاہے دوسرے کی، مقصد ایک ہی ہے کہ ایسا کرنا دین کے دشمن شیطان اور شیطانی طاقتوں کو کنکر مارنا ہے جو اس عزم کا اظہار ہے کہ ہم دین پر عامل رہیں گے اور اس کے دشمنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔

کنکری کو عربی میں ''جمرہ'' کہتے ہیں جس کی جمع ''جمرات'' ہے۔ چونکہ ان ستونوں کو کنکریاں ماری جاتی ہیں، اس لیے انہیں بھی ''جمرات'' ہی کا نام دے دیا گیا ہے۔

ان جمرات میں سے ایک کا نام ''جمرۂ اولیٰ'' ہے، دوسرے کا ''جمرہ وسطیٰ'' اور تیسرے کا ''جمرۂ عقبیٰ۔'' لوگ اپنی عام زبان میں جمرہ عقبیٰ کو ''بڑا شیطان''، جمرۂ وسطیٰ کو ''درمیانہ شیطان'' اور جمرہ اولیٰ کو ''چھوٹا شیطان'' کہتے ہیں۔ ان جمرات کو کنکر مارنے کے عمل کو ''رمی'' کہا جاتا ہے۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ خانہ کعبہ کے اردگرد کا علاقہ کئی کئی میل تک حرم قرار دے

دیا گیا ہے۔ یہ منیٰ کا میدان حرم کی حدود کے اندر ہے۔

مزدلفہ: منیٰ سے کچھ کلو میٹر آگے میدان مزدلفہ ہے۔ حاجی نو (۹) ذوالحجہ اور دس (۱۰) ذوالحجہ کی درمیانی رات یہاں بسر کرتے ہیں۔ مزدلفہ بھی حدودِ حرم میں داخل ہے۔

عرفات: مزدلفہ سے کچھ کلو میٹر آگے عرفات کا میدان ہے۔ یہاں ایک پہاڑ ہے جسے ''جبلِ عرفات'' کہا جاتا ہے۔ اس پہاڑ ہی کے باعث اس وادی کو ''وادیٔ عرفات'' یا ''میدانِ عرفات'' کہا جاتا ہے۔ میدانِ عرفات مکہ مکرمہ سے اندازاً پندرہ کلو میٹر کے فاصلے پر ہے اور حدودِ حرم سے باہر ہے۔

عرفات میں ایک مسجد ہے جس ''مسجدِ نمرہ'' کہا جاتا ہے۔ اسے ''مسجدِ عرفہ'' اور ''جامعِ ابراہیمؑ'' بھی کہتے ہیں۔ اس مسجد کی جو دیوار مکہ مکرمہ کی طرف ہے وہ حرم اور عرفات کے درمیان حدِ فاصل ہے یعنی جہاں حرم کی حدود ختم ہوتی ہیں، وہاں عرفات کی حدود شروع ہوتی ہیں۔ عرفات کے درمیان ایک متبرک پہاڑ ہے جسے ''جبلِ رحمت'' کہا جاتا ہے۔

ہر حاجی نے نو ذوالحجہ کو لازماً عرفات پہنچنا ہوتا ہے ورنہ اس کا حج نہیں ہوتا چاہے اس نے باقی سب مناسک حج ادا کر لیے ہوں۔

یہ ہیں وہ مقامات جہاں حج کے دوران حاجی کو جانا ہوتا ہے۔ اب آگے ''مناسکِ حج'' بیان ہوں گے یعنی حج کی رسوم کا وہ سارا سلسلہ جس کے مجموعے کو حج کہا جاتا ہے۔ اسے ''حج کا طریقہ'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ مناسکِ حج یہاں اسی ترتیب سے بیان ہوں گے جس ترتیب سے انہیں حج کے دوران ادا کیا جاتا ہے۔

حج کا طریقہ

''مناسکِ حج'' جیسے کہ بیان کیا جا چکا ہے پانچ یا چھ دن میں ادا کیے جاتے ہیں۔ ان کا آغاز آٹھ ذوالحجہ سے ہوتا ہے اور یہ سلسلہ بارہ یا تیرہ ذوالحجہ تک چلتا ہے۔ ان چھ دنوں کے اپنے اپنے مخصوص نام ہیں۔

ذوالحجہ کو ''یومُ الترویہ'' کہا جاتا ہے جس کا مطلب ہے ''سیراب کرنے کا دن۔'' لغات الحدیث جلد دوم صفحہ ۱۵۵ میں اس کا مطلب یہ لکھا ہے کہ اس دن کو ''یومُ الترویہ'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس دن اونٹوں کو پانی پلا کر سیراب کیا جاتا تھا۔

۹ ذوالحجہ کا نام ہے ''یوم عرفہ'' یعنی وہ دن جس میں عرفات جانا ہوتا ہے۔

۱۰ ذوالحجہ کا نام ہے ''یوم النَّحر'' یعنی قربانی کا دن' کیوں کہ اس دن حاجی قربانی کرتے ہیں۔

۱۱' ۱۲ اور ۱۳ ذوالحجہ کو ''ایامِ تشریق'' کہا جاتا ہے یعنی چمکدار دن۔ یہ خدا کو یاد کرنے اور دعا و استغفار کے دن ہوتے ہیں۔

احرام: حج کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ ۸ ذوالحجہ یعنی یومُ الترویہ کو حاجی غسل کر کے (اور اگر غسل نہ کر سکے تو وضو کر کے) حج کی نیت کر کے احرام باندھ لیتے ہیں۔ احرام حج کے مخصوص لباس کو کہتے ہیں اور مردوں اور عورتوں کے احرام میں فرق ہوتا ہے۔ مردوں کا احرام یہ ہے کہ وہ دو چادریں استعمال کریں جو سلی ہوئی نہ ہوں۔ ایک چادر بطور تہمد باندھ لی

جاتی ہے اور دوسری اس طرح اوڑھ لی جاتی ہے کہ دایاں بازو باہر رہے اور ان کے لیے یہ ضروری ہے کہ سر ننگا رکھیں۔

عورتوں کے لیے یہ پابندی نہیں کہ وہ سلے ہوئے کپڑے استعمال نہ کریں۔ بلکہ وہ ہر طرح کے سلے ہوئے کپڑے پہن سکتی ہیں مگر ان کے لیے ضروری ہے کہ چہروں پر نقاب نہ ڈالیں۔ عورتیں سر بھی ننگا نہیں رکھیں گی اور وہ رنگین کپڑے بھی استعمال کر سکتی ہیں بشرطیکہ وہ رنگ خوشبودار نہ ہوں۔ سرخ اور زرد رنگ کے کپڑے پہننا درست نہیں۔

تلبیہ: حج کی نیت کر کے احرام باندھنے کے ساتھ ہی تلبیہ بھی کہنا ہوتا ہے۔ تلبیہ کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

لَبَّیْکَ ○ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ ○ لَبَّیْکَ ○ لَاشَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ ○ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَۃَ لَکَ وَالْمُلْکَ لَاشَرِیْکَ لَکَ ○

"میں تیرے حضور میں حاضر ہوں اے اللہ میں تیرے حضور میں حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔ میں تیرے حضور میں حاضر ہوں۔ بیشک تعریف سب تیرے ہی لیے ہے اور نعمتیں سب تیری ہی دی ہوئی ہیں اور بادشاہی تیرا ہی حق ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔"

جب حضرت ابراہیمؑ نے خدا کے حکم سے خانہ کعبہ کو تعمیر کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم فرمایا تھا کہ اب حج کی منادی کرو تا کہ لوگ پیدل بھی اور سوار ہو کر بھی اس گھر کا حج کرنے کے لیے آئیں۔ اب جب حاجی پکارتا ہے کہ

لَبَّیْکَ ○ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ ○

(میں تیرے حضور میں حاضر ہوں، اے خدا، میں تیرے حضور میں حاضر ہوں)

بنایا تھا تو یہ سب زمین کعبے کے اندر تھی اور کعبہ مربع نہیں بلکہ مستطیل تھا۔ مگر ایک دفعہ جب کعبے کی عمارت بہت بوسیدہ ہوگئی تو قریش نے اسے ازسرنو بنایا۔ ان کے پاس سامان عمارت کم پڑ گیا تو انہوں نے یہ حطیم والا حصہ خانہ کعبہ سے باہر نکال کر کعبے کو مربع بنا دیا۔ پھر اس زمین کے اردگرد دیوار کھڑی کر دی گئی تا کہ پتہ رہے کہ یہ زمین کبھی کعبے کے اندر ہوتی تھی۔

احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کو بتایا تھا کہ قریش نے خانہ کعبہ کو بناتے ہوئے اسے حضرت ابراہیمؑ کی بنائی ہوئی عمارت سے کم بنایا ہے کیونکہ ان کے پاس سامانِ عمارت کم ہو گیا تھا۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے عرض کیا ہے کہ یا رسولؐ اللہ، تو پھر آپؐ اسے اسی طرح کیوں نہیں بنا دیتے جیسے ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا تو حضورؐ نے فرمایا کہ میں یہ کام اس لیے نہیں کرتا کہ میری قوم نے ابھی نیا نیا کفر چھوڑا ہے۔

حضورؐ کی مراد یہ تھی کہ چونکہ قریش کو ابھی کفر چھوڑے زیادہ دیر نہیں ہوئی، اس لیے اگر خانہ کعبہ کی موجودہ شکل میں کوئی تبدیلی کی گئی تو کہیں ایسے نہ ہو کہ یہ لوگ کسی فتنے کا شکار ہو جائیں۔ غرضیکہ حضورؐ نے کعبے کو اسی طرح رہنے دیا، تاہم یہ بات صاف ہوگئی کہ حطیم والی زمین شروع میں خانہ کعبہ کے اندر تھی۔

پھر جب حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ کا زمانہ آیا تو انہوں نے خانہ کعبہ کو ازسرنو بنایا اور چونکہ انہوں نے یہ سن رکھا تھا کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ اگر قریش کا اسلام نیا نیا نہ ہوتا تو میں خانہ کعبہ کو بنیاد ابراہیمی پر بنا دیتا، اس لیے انہوں نے حطیم کو خانہ کعبہ کے اندر داخل کر کے اسے ویسا ہی بنا دیا جیسا حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں تھا۔ مگر کچھ عرصے بعد جب حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ شہید ہو گئے اور مکہ مکرمہ پر بنو امیہ کا قبضہ ہو گیا تو بنو امیہ کے گورنر

جو شخص حالت احرام میں ہو اسے مُحرِم کہا جاتا ہے اور مُحرِم پر بہت سی ایسی پابندیاں لگ جاتی ہیں جو حالت احرام سے باہر نہیں ہوتیں۔ احرام کا مطلب ہے ''حرام کرنا'' اور احرام کو احرام اسی لیے کہا جاتا ہے کہ یہ بہت سی ایسی چیزوں کو وقتی طور پر حرام کر دیتا ہے جو معمولی حالات میں حلال ہوتی ہیں اور ایسے ہی وہ اعمال جو بذاتِ خود بھی ناجائز ہوتے ہیں' حالتِ احرام میں ان سے خصوصی طور پر پرہیز کرنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۭ (البقرہ : ۱۹۷)

(حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں جو شخص اس مقرر مہینوں میں حج کی نیت کرے اسے خبردار رہنا چاہئے کہ حج کے دوران میں اس سے کوئی شہوانی فعل' کوئی بدعملی' کوئی لڑائی جھگڑے کی بات سرزد نہ ہو)

ایسے ہی سورۃ المائدہ آیت ۹۵ میں فرمایا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ

(اے ایمان لانے والو' احرام کی حالت میں شکار نہ مارو)

حضرت شاہ ولی اللہؒ احرام کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''حج و عمرہ میں جو احرام باندھا جاتا ہے' وہ نماز کی تکبیر تحریمہ کی طرح ہے۔ وہ اخلاص و تعظیم اور عزیمتِ مومن کی ایک ظاہری و عملی صورت آرائی ہے۔ اس کا مقصد لذتوں اور عادتوں اور آرائش و زیبائش کی تمام قسموں کو ترک کر کے نفس کو حقیر اور اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز و سرنگوں بنانا اور اللہ تعالیٰ کے لیے آشفتہ سری' پریشان حالی اور کلفت و تعب کا مظاہرہ کرنا ہے۔''

تفہیم القرآن' جلد اول' صفحہ ۱۴۳ پر احرام کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

''احرام اس فقیرانہ لباس کو کہتے ہیں جو زیارتِ کعبہ کے لیے پہنا جاتا ہے۔ اس لباس میں صرف ایک تہہ ہوتا ہے اور ایک چادر جو اوپر سے اوڑھی جاتی ہے۔ اسے ''احرام'' اس لیے کہتے ہیں کہ اسے باندھنے کے بعد آدمی پر بہت سی وہ چیزیں حرام ہو جاتی ہیں جو معمولی حالات میں حلال ہیں مثلاً

☆ حجامت'

☆ خوشبو کا استعمال'

☆ ہر قسم کی زینت و آرائش'

☆ اور قضائے شہوت۔

☆ انہیں پابندیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی جاندار کو ہلاک نہ کیا جائے نہ شکار کیا جائے اور نہ کسی کو شکار کا پتہ دیا جائے۔''

کُتب فقہ میں تفصیل سے ان سب پابندیوں کو بیان کر دیا گیا ہے جو احرام کی حالت میں انسان پر عائد ہو جاتی ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان بحالت احرام میں تمام شہوانی خواہشات' تفریحی سرگرمیوں' زیب و زینت' دنگے فساد اور خونریزی سے علیحدہ رہے۔

احرام باندھتے ہی حاجی کو عاجزی' انکساری' ذوق و شوق' خلوص اور پرہیزگاری کی تصویر بن جانا چاہیے۔ احرام خود ایک عاجزانہ لباس ہے اور احرام کی حالت میں اللہ تعالیٰ کو عاجزی اور انکساری ہی پسند ہے۔ گویا عاجزی اور انکساری حاجی کا زیور ہے۔ حج کرنے والے کا رویہ ایسا ہونا چاہیے گویا ایک غلام مجسم غلامی بن کر انتہائی عاجزی سے آقا کے اشاروں پر حرکت کر رہا ہے۔

منیٰ میں قیام: اس طرح احرام باندھنے کے بعد "یوم الترویہ" یعنی آٹھ ذوالحجہ کو حاجی تلبیہ پڑھتے مکہ مکرمہ سے نکل کر منیٰ کے میدان کی طرف چل پڑتے ہیں۔ راستے میں ایک پہاڑ "جبلِ نور" آتا ہے۔ اسی پہاڑ کی چوٹی پر "غارِ حرا" ہے جہاں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلی وحی نازل ہوئی تھی۔ اس کے بعد منیٰ آجاتا ہے۔ منیٰ میں ایک بہت وسیع مسجد ہے۔ جسے "مسجد خیف" کہا جاتا ہے۔ منیٰ کے قیام کے دوران حاجی اسی مسجد میں نماز پڑھتے ہیں۔ منیٰ پہنچ کر لوگ اگلے دن کی صبح تک یہیں قیام کرتے ہیں۔ منیٰ میں وہ ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں پڑھتے ہیں اور آٹھ اور نو ذوالحجہ کی درمیانی رات یہیں گزار کر دوسرے دن ۹ ذوالحجہ کو صبح کی نماز ادا کر کے طلوعِ آفتاب کے بعد میدانِ عرفات کی طرف چل پڑتے ہیں۔ عرفات جاتے ہوئے مزدلفہ راہ میں آئے گا۔ مگر جاتے ہوئے وہاں قیام نہیں کیا جاتا۔

وقوفِ عرفات: یہ ۹ ذوالحجہ ہے۔ ایامِ حج کا اہم ترین دن۔ عرفِ عام میں بھی اسی دن کو حج کا دن کہا جاتا ہے حالانکہ حج کی رسوم اس سے ایک دن پہلے شروع ہو جاتی ہیں اور اس سے تین چار دن بعد تک چلتی رہتی ہیں۔ آج کے دن یہ ضروری ہے کہ ہر حاجی میدان عرفات میں ضرور پہنچ جائے۔ اگر آج کوئی عرفات نہ پہنچا تو اس کا حج نہیں ہوگا چاہے اس نے باقی سب مناسک ادا کیے ہوں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

اَلْحَجُّ عَرَفَةُ یعنی حج عرفات (میں ٹھہرنے کا نام) ہے۔

قبیلہ قریش خانہ کعبہ کے متولی ہونے کے باعث اپنے آپ کو دوسرے قبائل عرب سے بہت ممتاز سمجھتے تھے۔ لہٰذا اپنی خصوصی شان دکھانے کے لیے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ حج کے دوران عرفات تک پہنچنے کے بجائے مزدلفہ ہی میں ٹھہر کر واپس

آجاتے تھے۔ کلام پاک میں اس اختصاص کی نفی کی گئی ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ سبھی لوگ عرفات تک پہنچ کر پھر پلٹیں۔ سورۃ البقرہ' آیت ۱۹۹ میں حکم دیا گیا ہے کہ:

ثُمَّ اَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ. (پھر جہاں سے اور سب لوگ پلٹتے ہیں وہیں سے تم بھی پلٹو اور اللہ سے معافی چاہو۔)

سید ابوالاعلیٰ مودودی اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے زمانے سے عرب کا معروف طریقہ حج یہ تھا کہ ۹ ذوالحجہ کو منیٰ سے عرفات جاتے تھے اور رات کو وہاں سے پلٹ کر مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے مگر بعد کے زمانے میں جب رفتہ رفتہ قریش کی برہمنیت قائم ہوگئی' تو انہوں نے کہا: ہم اہلِ حرم ہیں' ہمارے مرتبے سے یہ بات فروتر ہے کہ ہم عام اہلِ عرب کے ساتھ عرفات تک جائیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے لیے یہ شان امتیاز قائم کی کہ مزدلفہ تک جا کر ہی پلٹ آتے اور عام لوگوں کو عرفات تک جانے کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔ پھر یہی امتیاز بنوخزاعہ اور بنوکنانہ اور ان دوسرے قبیلوں کو بھی حاصل ہوگیا' جن کے ساتھ قریش کے شادی بیاہ کے رشتے تھے۔ آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ جو قبیلے قریش کے حلیف تھے' ان کی شان بھی عام عربوں سے اونچی ہوگئی اور انہوں نے بھی عرفات جانا چھوڑ دیا۔ اس فخر و غرور کا بت اس آیت میں توڑا گیا ہے۔ آیت کا خطاب عام ان سب کی طرف ہے جو آئندہ کبھی اس قسم کے امتیازات اپنے لیے مخصوص کرنا چاہیں۔ انہیں حکم دیا جارہا ہے کہ اور سب لوگ جہاں تک جاتے ہیں انہیں کے ساتھ جاؤ' انہیں کے ساتھ ٹھہرو' انہیں کے ساتھ پلٹو اور اب تک جاہلیت کے فخر و غرور کی بناء پر سنتِ ابراہیمیؑ کی جو خلاف ورزی تم کرتے رہے ہو اس پر اللہ سے معافی مانگو۔'' (تفہیم القرآن' جلد ۱' صفحہ ۱۵۷)

مولانا سید سلیمان ندوی سیرۃ النبیؐ جلد پنجم میں عرفات کا منظر کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں:

"عرفات میں ۹ ذوالحجہ کو تمام حاجیوں کو ٹھہرنا اور زوال کے بعد سے غروب (آفتاب) تک یہاں دعا اور خدا کی حمد میں مصروف رہنا پڑتا ہے اور اصل حج اسی کا نام ہے۔ یہاں کوسوں تک جہاں تک نظر کام کرتی ہے، ملک ملک کے لوگ ایک طرز اور ایک لباس میں کھڑے ہو کر زور و زار اپنے گناہوں کی معافی مانگتے اور خدا سے اپنا نیا عہد باندھتے ہیں۔ یہیں جبلِ رحمت کے پاس کھڑے ہو کر اسلام کا امیر تمام دنیا سے آئے ہوئے حاجیوں کے سامنے خطبہ عام دیتا ہے اور انہیں ان کے فرائض سے آگاہ کرتا ہے۔ عرفات کے اس وقوف میں ایک طرف تو اسلام کی شان و شوکت کی ایک عظیم الشان نمائش ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ اجتماعِ عظیم روزِ حشر کی یاد دلاتا ہے اور یہی سبب ہے کہ سورہ حج کا آغاز حشر کے بیان سے ہوتا ہے۔ یہ اجتماع اور اس کا بے نظیر مؤثر منظر دلوں میں مغفرت اور رحمت الٰہی کی طلب کا طوفان انگیز جوش پیدا کرتا ہے۔ ہر شخص کو دائیں، بائیں، آگے، پیچھے دور تک یہی منظر نظر آتا ہے تو وہ خود اثر میں ایسا ڈوب جاتا ہے کہ زندگی بھر اس کی لذت باقی رہ جاتی ہے۔"

یہ دن بے پناہ فضیلت کا حامل ہے۔

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی دن ایسا نہیں جس میں اللہ عزوجل عرفے کے دن سے زیادہ لوگوں کو دوزخ سے آزاد کرتا ہو اور بے شک اللہ (اس دن عرفات میں جمع ہونے والوں کے بہت ہی) قریب ہو جاتا ہے اور فرشتوں کے سامنے ان پر فخر کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ یہ کس ارادے سے جمع ہوئے ہیں۔ (مسلم)

مراد یہ ہے کہ یہ لوگ میری رضا حاصل کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں اور مجھے ان پر فخر ہے۔ حضورؐ کا فرمان ہے:

خَيْرُ الدُّعَآءِ دُعَآءُ يَوْمِ عَرَفَةَ. (یعنی بہترین دعا عرفات کے دن کی دعا ہے۔) (مشکوٰۃ)

طلحہ بن عبید اللہ بن کریز بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیطان یوم عرفہ سے زیادہ ذلیل، راندہ، حقیر اور جلا بھنا کسی اور دن نہیں دیکھا گیا سوائے یوم بدر کے (بدر کے دن) اس نے جبرئیلؑ کو دیکھا کہ وہ فرشتوں کی صفوں کو ترتیب دے رہے تھے (یہ دیکھ کر وہ سخت ذلیل ہوا اور غصے میں بھر گیا اور ایسے ہی وہ یوم عرفہ کو سخت ذلت محسوس کرتا اور غصے کی حالت میں ہوتا ہے) اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ دیکھتا ہے کہ خدا کی رحمت (موسلا دھار بارش کی طرح) برس رہی ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے بڑے گناہوں کو معاف فرما رہا ہے (اور انسان کا یہ فائدہ اس کی برداشت سے باہر ہے)۔ (مشکوٰۃ)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب عرفے کا دن ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ آسمان دنیا (یعنی پہلے آسمان) پر اتر آتا ہے اور فرشتوں کے سامنے میدانِ عرفات میں حاضر ہونے والے اپنے بندوں پر فخر کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ میرے بندوں کی طرف دیکھو۔ یہ پراگندہ بال، گرد آلود، ہر دور کی راہ سے (لبیک لبیک) پکارتے میری خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ میں تمہیں گواہ بناتا ہوں (اس بات پر) کہ میں نے انہیں بخش دیا ہے۔ اس پر فرشتے عرض کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار (ان میں تو) فلاں شخص (بھی ہے جس) کو بدکار کہا جاتا تھا اور فلاں مرد بھی اور فلاں عورت (بھی ہے جو گنہگار سمجھے جاتے رہے ہیں) حضورؐ نے فرمایا کہ اللہ عزوجل فرمائے گا کہ میں نے ان سب کو بخش دیا۔ (پھر) رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی دن ایسا نہیں جس میں

یومِ عرفہ سے زیادہ لوگوں کو آگ سے آزاد کیا جاتا ہو۔ (مشکوٰۃ)

۹ ذوالحجہ کو پانچ فرض نمازوں کی یہ صورت ہوتی ہے کہ انہیں تین اوقات میں اور تین مختلف مقامات پر ادا کیا جاتا ہے۔ فجر کی نماز منیٰ میں پڑھی جاتی ہے۔ ظہر اور عصر کی نمازوں کو ملا کر میدانِ عرفات میں ادا کیا جاتا ہے اور اسی طرح مغرب اور عشاء کو ملا کر مزدلفہ میں ادا کیا جاتا ہے۔ کیونکہ وقوف عرفات زوال سے لے کر غروب آفتاب تک ہوتا ہے۔ اس کے بعد سب لوگ واپس پلٹتے ہیں اور رات مزدلفہ میں بسر کرتے ہیں اور جب بھی وہ مزدلفہ میں پہنچیں مغرب اور عشاء انہوں نے وہیں ادا کرنا ہوتی ہیں۔

حج کا دن خاص طور پر ذکر الٰہی کرنے' گناہوں کی بخشش مانگنے اور دعائیں کرنے کا دن ہوتا ہے' اور وہ انسان زیاں کار ہے جو ان پانچ چھ گھنٹوں کا ایک لمحہ بھی ضائع کرے۔

دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں جس سے کبھی نہ کبھی کوئی گناہ سرزد نہ ہوا ہو' نہ کوئی ایسا ہے جو یہ نہ چاہتا ہو کہ وہ اپنی غلطیوں کی سزا سے بچ جائے نہ کوئی خوشحالی اور بے نیازی کے اس مقام پر پہنچا ہوا ہے کہ اس کی خواہشات اور حاجتیں ختم ہو جائیں اور نہ کوئی ایسی غم پروف طبیعت رکھتا ہے کہ وہ کبھی پریشانیوں اور احساسِ غم کا شکار نہ ہو۔

جب تک انسان اس عالمِ آب وگل میں گھرا ہوا ہے اس سے غلطیاں بھی ضرور سرزد ہوں گی۔ اس کی یہ طبعی خواہش بھی ہوگی کہ وہ ان کی سزا سے بچ جائے' اس کی ضرورتیں اور آرزوئیں بھی اس کے دامن سے چمٹی رہیں گی اور اسے پریشانیاں اور خدشات بھی گھیرے رہیں گے۔

کون ایسا پارسا ہے کہ اس نے کبھی بھی کوئی چھوٹا موٹا گناہ بھی نہ کیا ہو؟

کون اتنا اذیت پسند ہے کہ وہ اپنے کیے کی سزا سے بچ جانے کا متمنی نہ ہو؟

کون نہیں چاہتا کہ اس کی اولاد فرمانبردار' نیک اور لائق ہو؟

کس کے دل میں یہ تمنا نہیں کہ وہ خود اور اس کے سب متعلقین بیماریوں سے محفوظ رہیں؟

کس کے دل میں یہ آرزو نہیں کہ اس کی روزی میں برکت ہو اور وہ مالی مشکلات کا شکار نہ ہو؟

کون اس بات کی خواہش نہیں رکھتا کہ وہ بے عزتی، رسوائی اور بدنامی سے بچا رہے؟

کون اس فکر میں سرگرداں نہیں کہ وہ بخیر و خوبی اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرے؟

کون اس بات کا متمنی نہیں کہ وہ عزت کی زندگی جیے اور عزت کی موت مرے؟

پھر یہ بھی عین ممکن ہے کہ آپ کے دل میں کوئی ایسا جان لیوا غم ہو جسے کسی کے سامنے بیان بھی نہ کیا جا سکتا ہو اور وہ اندر ہی اندر آپ کو کھائے جا رہا ہو۔

عجب نہیں کہ اس فکر نے آپ کی راتوں کی نیند اڑا رکھی ہو کہ کل کیا ہوگا؟

عجب نہیں کہ کسی بچے کی بے راہروی یا کسی بچی کی شادی کا لیٹ ہو جانا آپ کے لیے سخت قلبی اذیت کا باعث بنا ہوا ہو۔

عجب نہیں کہ کسی صاحب رسوخ حاسد یا دشمن نے آپ کی زندگی اجیرن کر رکھی ہو۔

شاید کہ آپ کے وطن کو غداروں، الحاد پسندوں اور زر پرستوں نے غم خانہ بنا رکھا ہو۔

شاید کہ ذاتی طور پر خوش قسمت ہونے کے باوجود آپ کو کسی پہلو قرار نہ آتا ہو کہ جس کشمیر میں نوے فیصد مسلم آبادی بستی تھی، وہ بت پرستوں کے قبضے میں ہے، جس قبلہ اول کی خاطر آپ نے صدیوں اہل یورپ سے جنگ کی تھی اس پر یہودی قابض ہیں، فلسطینیوں کے لیے دنیا میں کوئی ٹکانا نہیں ہے۔ فلپائن، برما، بھارت اور کئی اور مسلم اقلیت

والے علاقوں میں مسلمان بہن بھائیوں پر ظلم توڑے جا رہے ہیں لبنان مدتوں سے خانہ جنگی کا شکار ہے اور افریقہ اور ایشیا کے کئی نو آزاد مسلم ممالک طرح طرح کی الجھنوں اور بے چینیوں کے چنگل میں ہیں۔

شاید اس غم نے آپ کے سینے میں ناسور کر رکھا ہو کہ جس ملت کو اس معزز کام پر سرفراز کیا گیا تھا کہ وہ اہلِ دنیا کو ہدایت کی راہ دکھائے' اس میں بے شمار احمق ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو اپنے اپنے علاقوں کی پرانی جاہلی گمراہ تہذیبوں سے تعلق جوڑنے کو عزت سمجھ رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی میں بے شمار اقسام کے غم' بے شمار انواع کی پریشانیاں اور طرح طرح کی اذیتیں ہیں۔ شاید کہ آپ ان میں سے بہت سے غموں' بہت سی پریشانیوں اور بہت سی اذیتوں کے شکار ہوں۔

مگر یاد رکھیے کہ انفرادی دکھ ہوں یا اجتماعی' جسمانی اذیتیں ہوں یا روحانی' دینی پریشانیاں ہوں یا دنیاوی' قومی مسائل ہوں یا بین الاقوامی' آپ کے چھوٹے سے اسلامی ملک کا معاملہ ہو یا سارے عالمِ اسلام کا' آج کے دن آپ ایک ایسے قادرِ مطلق' صاحبِ اختیار اور مہربان حکمران کے حضور میں حاضر ہیں' جس کے لیے آپ کے ہر گناہ کو معاف کرنا' آپ کی ہر خواہش کو پورا کرنا اور آپ کے ہر غم کو دور کرنا اس سے زیادہ آسان ہے جتنا آپ کے لیے ایک کمزور تنکا توڑنا۔

وہ خود فرماتا ہے:

اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَا اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ۝ (النحل ۴۰)	''ہمیں کسی چیز کو وجود میں لانے کے لیے اس سے زیادہ کچھ کرنا نہیں ہوتا کہ اسے حکم دیں کہ 'ہو جا' اور بس وہ ہو جاتی ہے۔''

ایک حدیث قدسی میں حضورؐ کی طرف سے بیان ہوا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر ارشاد فرماتا ہے:

''اے میرے بندو! اگر اول سے آخر تک سب انسان اور جن ایک میدان میں جمع ہو جائیں اور مجھ سے (اپنی مرادیں) مانگیں اور میں ہر ایک کی مرادیں پوری کر دوں تو اس سے میرے خزانوں میں سے اس سے زیادہ کم نہیں ہو سکتا جتنا کہ ایک سوئی کو دریا میں داخل کر کے نکال لینے سے (دریا کا پانی کم ہوتا ہے'')

اور جہاں تک ہم گنہگار انسانوں کے گناہوں کا تعلق ہے۔

حضرت انسؓ بن مالک بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے کہ ''اے آدمؑ کے بیٹے! جب تک تو مجھ سے دعا کرتا رہے گا اور مجھ سے امید لگائے رکھے گا میں تجھے بخشتا رہوں گا' چاہے تو نے کتنے ہی گناہ کیوں نہ کیے ہوں' میں پروا نہیں کروں گا۔ اے آدمؑ کے بیٹے! اگر تیرے گناہ آسمان تک پہنچ جائیں اور پھر تو مجھ سے بخشش مانگے تو میں تجھے بخش دوں گا اور (تیرے گناہوں کی) پروا نہیں کروں گا۔ اے آدمؑ کے بیٹے! اگر تو زمین بھر خطائیں لے کر بھی میرے پاس آئے گا' پھر مجھ سے اس حالت میں ملے گا کہ تو نے میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا ہوگا' تو میں تجھے زمین بھر بخشش عطا کر دوں گا۔'' (ترمذی)

پس آج جب آپ اس رؤف وغفار کی رحمت و رافت کے صدقے میں اس میدان میں پہنچ گئے ہیں تو آپ کو ایک سنہری موقع بہم پہنچا دیا گیا ہے کہ آپ اپنے زندگی بھر کے گناہ بخشوا کر ان کی سزا سے بھی بچ جائیں اور اپنی خواہشوں اور ضرورتوں کے پورا ہونے کا بندوبست بھی کر لیں اور ان مصائب اور پریشانیوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا اہتمام بھی کر لیں جن سے آپ اس وقت دوچار ہیں یا جن سے دوچار ہونے کا آپ کو خدشہ ہے۔

کچھ پریشانیاں آپ اپنے گھروں سے لے کر آئے ہوں گے اور کچھ اس مبارک سفر کی راہ میں بھی اکٹھی ہو گئی ہوں گی، مگر پریشانیاں چاہے کتنی ہی زیادہ اور کتنی ہی اقسام کی کیوں نہ ہوں، انہیں اس بات کی اجازت نہ دیجئے کہ وہ آپ کے ان تھوڑے سے گھنٹوں کو یا ان کے کچھ حصے کو ہی ضائع کر دیں۔

پوری توجہ اور خلوص سے خدا کی عبادت کریں۔

پورے تضرع وزاری سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں۔

پورے اعتماد علی اللہ سے اپنی احاجات اور خواہشات کو اس کے حضور میں پیش کریں۔

اور پورے خشوع وخضوع سے اسے اپنا دکھ درد سنائیں۔

اس نے خود ارشاد فرمایا ہوا ہے:

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ط اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ع. (البقرہ : ۱۸۶)

"اور (اے نبیؐ) جب میرے بندے تم سے میرے متعلق پوچھیں تو انہیں بتا دو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں۔"

یاد رکھنا چاہیے کہ منیٰ میں انسان چار پانچ دن گزارتا ہے، مزدلفہ میں ساری رات بسر کرتا ہے مگر عرفات میں اس کا قیام صرف زوال سے غروبِ آفتاب تک ہی ہوتا ہے۔ اس تھوڑے سے وقت کا ہر لمحہ حتی الامکان ذکرِ الٰہی، استغفار اور دعا پر صرف کرنا چاہیے۔ اس کا کچھ حصہ بھی اگر فضول باتوں اور شکوہ شکایت پر صرف ہو گیا تو یہ نقصان کا سودا ہو گا اور آپ اپنی ذمہ داریوں کو چھوڑ کر اور دور دراز کے سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے اس لیے نہیں

آئے کہ نقصان کا سودا کریں۔ آپ تو ''نفع'' کا سودا کرنے آئے ہیں ''سچے اور دائمی نفع'' کا' اس لیے اس قیمتی وقت کا ہر لمحہ نفع کے سودے پر صرف کریں اور بامراد واپس جائیں۔ انشاءاللہ۔

وقوفِ مزدلفہ: یہ ۹ اور ۱۰ ذوالحجہ کی درمیانی رات ہے جو مزدلفہ گزاری جاتی ہے۔ مزدلفہ منیٰ اور عرفات کے درمیان واقع ہے۔ یہاں مغرب کی نماز کو عشاء کی نماز کے ساتھ ملا کر ایک وقت میں ادا کیا جاتا ہے۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نمازیں ملا کر پڑھیں۔ (بخاری)

میدانِ عرفات میں سارا دن عبادت کرتے رہنے کے باعث انسان تھکا ہوا ہوتا ہے۔ اس لیے اس رات اگر وہ آرام کرنے کے لیے سو جائے تو حرج نہیں مگر صبح اٹھ کر اول وقت میں نماز ادا کر کے پھر عبادت کرنا چاہئے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہی روایت کیا گیا ہے کہ اس رات آپ مغرب و عشاء پڑھ کر سو گئے اور فجر کے بعد قبلہ رخ کھڑے ہو کر خوب روشنی ہونے تک خدا کے ذکر میں مشغول رہے۔

لہٰذا اس مقام پر استغفار، تکبیر اور تہلیل کی جاتی ہے اور کثرت سے خدا کو یاد کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ سورۃ البقرہ آیت ۱۹۸ میں فرمایا گیا ہے:

فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ص وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ج وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝ (البقرہ: ۱۹۸)	''پھر جب عرفات سے چلو تو مشعرِ حرام (مزدلفہ) کے پاس ٹھہر کر اللہ کو یاد کرو اور اس طرح یاد کرو جس کی ہدایت اس نے تمہیں دی ہے' ورنہ اس سے پہلے تو تم لوگ گمراہ تھے۔''

مولانا امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''عرفات سے واپس ہوتے ہوئے مشعر حرام (مزدلفہ) میں رات گزارنے اور وہاں اللہ کی یاد کرنے کا حکم ہے۔ اس یاد کرنے کے متعلق یہ ہدایت فرمائی ہے کہ یہ اس طریقے پر ہو جو اللہ نے تمہیں بتایا اور سکھایا ہے۔ یعنی تسبیح و تہلیل اور ذکر و عبادت کی صورت میں، اس طریقے پر نہ ہو جو تم نے جاہلیت میں اختیار کر رکھا تھا..... جاہلیت میں لوگ مزدلفہ میں جگہ جگہ آگ جلاتے اور قصیدہ خوانی، داستان گوئی اور مفاخرت کی مجلسیں منعقد کرتے تھے۔ قرآن نے ان چیزوں کی جگہ ان کو تسبیح و تہلیل کی ہدایت فرمائی ہے اس لیے کہ اصلاً ان مقامات کی حاضری اسی مقصد کے لیے ہے۔''

وقوفِ منیٰ: مزدلفہ میں رات گزار کر دس تاریخ کو حاجی منیٰ واپس آجاتے ہیں۔ یہ وہی دن ہے جب عالم اسلام میں عید الاضحیٰ یعنی بقر عید منائی جاتی ہے۔ حج کرنے والوں کے لیے آج کا دن بہت مصروف دن ہے۔ آج انہوں نے کئی مناسک ادا کرنے ہیں مثلاً۔

جمرۂ عقبیٰ کو کنکر مارنے ہیں۔

قربانی کرنی ہے۔

بال اتروانے ہیں (خواتین کے لیے یہ ہے کہ صرف تھوڑے سے بال کاٹ لیں)

احرام اتارنا ہے،

طواف کرنا ہے،

صفا مروہ کی سعی کرنی ہے۔

ان میں سے پہلے چار کام تو میدان منیٰ ہی میں ہوں گے اور آخری دو یعنی طواف

اور سعی کرنے کے لیے کچھ دیر کے لیے مکہ مکرمہ جانا ہوگا۔

رَمی: منیٰ میں آکر پہلا کام یہ ہے کہ بڑے شیطان یعنی جمرۂ عقبیٰ کو کنکر مارنے ہیں جسے ''رمی'' کہتے ہیں۔ کنکر سات کی تعداد میں مارے جاتے ہیں۔ دس تاریخ کو صرف جمرۂ عقبیٰ کو کنکر مارے جاتے ہیں اور گیارہ، بارہ اور تیرہ کو تینوں جمرات کو سات سات کنکر مارے جاتے ہیں۔ چونکہ اللہ کی طرف سے اجازت ہے کہ اگر کوئی بارہ تاریخ ہی کو منیٰ سے جانا چاہے تو چلا جائے۔ اس لیے جو لوگ بارہ تاریخ کو واپس مکہ چلے جائیں گے وہ کل انچاس کنکر ماریں گے۔ سات دس تاریخ کے، اکیس گیارہ تاریخ کے اور اکیس بارہ تاریخ کے۔ اور جو تیرہ کو واپس جائیں گے وہ چونکہ تیرہ تاریخ کے اکیس کنکر بھی ماریں گے، اس لیے ان کے کنکروں کی کل تعداد ستر ہوگی۔

بعض لوگ مزدلفہ ہی سے کنکر چن کر ساتھ لے آتے ہیں۔ بعض مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان کی ایک وادی 'وادی محسر'' سے چنتے ہیں۔ یہ کنکر نہ تو بہت بڑے ہونے چاہئیں نہ بہت چھوٹے۔ اندازاً چنے کے دانے کے برابر کنکر ٹھیک سمجھے جاتے ہیں۔ ساتوں کنکر مٹھی میں بھر کر ایک ہی بار پھینک دینا درست نہیں بلکہ ہر کنکر علیحدہ علیحدہ مارا جائے۔ کنکر کو تاک کر مارنا چاہیے اور ہر کنکر کو مارتے وقت ''اللہ اکبر'' پڑھا جائے۔

یاد کیجئے کہ احرام باندھتے وقت پہلا کام یہ تھا کہ تلبیہ پڑھا گیا تھا۔ اس تمام دوران میں وقفے وقفے سے تلبیہ جاری رہے گا، لیکن دس تاریخ کو جمرۂ عقبیٰ کو کنکر مارنے سے پہلے تلبیہ پڑھنا موقوف کر دیا جائے گا یعنی تلبیہ پڑھنا آٹھ تاریخ کو احرام باندھنے سے لے کر دس تاریخ کو جمرۂ عقبیٰ کو کنکر مارنے سے پہلے تک جاری رکھا جاتا ہے۔

قربانی: رمی کے بعد قربانی کرنی ہے جو حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کی یادگار ہے۔ کلام پاک سے پتہ چلتا ہے کہ خدا کے نام کی قربانی دینا ایسی عبادت ہے جو ہر قوم میں موجود رہی

ہے۔سورۃ الحج' آیت ۳۴ میں فرمایا گیا ہے۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ط

(سورۃ الحج : ۳۴)

''ہر امت کے لیے ہم نے قربانی کا ایک قاعدہ مقرر کر دیا ہے تا کہ (اس امت کے) لوگ ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو بخشے ہیں۔''

سید ابوالاعلیٰ مودودی اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''قربانی تمام شرائع الٰہیہ کے نظامِ عبادت کا ایک لازمی جزء رہی ہے۔ توحید فی العبادت کے بنیادی تقاضوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان نے جن جن صورتوں سے غیر اللہ کی بندگی کی ہے ان سب کو غیر اللہ کے لیے ممنوع کر کے صرف اللہ کے لیے مختص کر دیا جائے۔ مثلاً انسان نے غیر اللہ کے آگے رکوع و سجود کیا ہے۔ شرائع الٰہیہ نے اسے اللہ کے لیے خاص کر دیا۔ انسان نے غیر اللہ کے آگے مالی نذرانے پیش کیے ہیں' شرائع الٰہیہ نے انہیں ممنوع کر کے زکوٰۃ و صدقہ اللہ کے لیے واجب کر دیا۔ انسان نے معبودانِ باطل کی تیرتھ یاترا کی ہے' شرائع الٰہیہ نے کسی نہ کسی مقام کو مقدس یا بیت اللہ قرار دے کر اس کی زیارت اور طواف کا حکم دے دیا۔ انسان نے غیر اللہ کے نام کے روزے رکھے' شرائع الٰہیہ نے انہیں بھی اللہ کے لیے مختص کر دیا۔ ٹھیک اسی طرح انسان اپنے خود ساختہ معبودوں کے لیے جانوروں کی قربانیاں بھی کرتا رہا ہے اور شرائع الٰہیہ نے اسے بھی غیر کے لیے قطعی حرام اور اللہ کے لیے واجب کر دیا۔'' (تفہیم القرآن' جلد سوم)

کتبِ احادیث میں بھی قربانی کی بہت فضیلت آئی ہے۔

حضرت زیدؓ بن ارقم بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ' یہ قربانیاں کیا ہیں؟ حضورؐ نے فرمایا یہ تمہارے باپ ابراہیمؑ کی

سنت ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ اس (سنت پر عمل کرنے) سے ہمیں کیا فائدہ پہنچے گا۔ آپؐ نے فرمایا کہ (تمہیں قربانی کے جانور کے جسم کے) ہر بال کے عوض ایک نیکی (ملے گی)..... (ابن ماجہ)

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "قربانی کے دن آدمؑ کا بیٹا کوئی ایسا عمل نہیں کرتا جو اللہ کو خون بہانے (یعنی قربانی کرنے) سے زیادہ محبوب ہو اور قربانی کا جانور قیامت کے دن اپنے سینگوں اور ناخنوں اور بالوں سمیت آئے گا اور (قربانی کا) خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک رتبہ حاصل کر لیتا ہے۔ (پس (اے مسلمانو) قربانی کر کے اپنے دلوں کو خوش کرو۔" (ابن ماجہ)

اگرچہ قربانی ذوالحجہ کی دس، گیارہ اور بارہ تینوں تاریخوں میں کی جا سکتی ہے تاہم فضیلت والی بات یہی ہے کہ دس تاریخ ہی کو قربانی کر لی جائے۔

حلق: قربانی کے بعد سر کے بال اتروائے جاتے ہیں اور پھر احرام کھول دیا جاتا ہے۔ مرد اپنے بال منڈوا دیتے ہیں یا ترشوا لیتے ہیں۔ دونوں باتیں جائز ہیں مگر منڈوانا زیادہ فضیلت کی بات ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ اے اللہ، سر منڈانے والوں پر رحم فرمایا۔ صحابہؓ نے عرض کیا "اور بال ترشوانے والوں پر (بھی) یا رسولؐ اللہ۔" حضور نے (پھر وہی) فرمایا کہ اے اللہ، سر منڈانے والوں پر رحم فرما۔ صحابہؓ نے (پھر) عرض کیا "اور بال ترشوانے والوں پر (بھی) یا رسولؐ اللہ۔" (اس دفعہ) آپؐ نے فرمایا۔ "اور بال ترشوانے والوں پر (بھی فرما)" (بخاری)

صحیح بخاری میں اسی مضمون کی ایک اور حدیث بھی بیان ہوئی ہے جس میں حضورؐ نے "رحم فرما" کے بجائے "بخش دے" دعا کی ہے۔ اس حدیث کے آخر میں بیان ہوا ہے

کہ حضورؐ نے تین دفعہ یہ فرمایا کہ ''اے اللہ سر منڈوانے والوں کو بخش دے۔'' صحابہؓ ساتھ ساتھ کہتے گئے۔ ''اور بال ترشوانے والوں کو (بھی) یا رسولؐ اللہ۔'' تو چوتھی دفعہ آپؐ نے فرمایا ''اور بال ترشوانے والوں کو (بھی)''

اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ حاجی کے لیے سر منڈوانا زیادہ فضیلت والی بات ہے اگرچہ بال ترشوانا بھی درست ہے۔ بال منڈوانے کو ''حلق'' کہا جاتا ہے۔

حج کی اس رسم کے بارے میں سید سلیمان ندوی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ سید سلیمان فرماتے ہیں:

''منیٰ میں قربانی کے بعد حاجی سر کے بال منڈواتے یا ترشواتے ہیں۔ یہ اس پرانی رسم کی تعمیل ہے کہ نذر دینے والے جب نذر کے دن پورے کر لیتے تو اپنے بال منڈواتے۔ ساتھ ہی اس رسم میں ایک اور پرانی یادگار کا اشارہ چھپا ہے۔ تمدن کے ابتدائی عہد میں دستور تھا کہ جو شخص غلام بنا کر آزاد کیا جاتا تھا اس کے سر کے بال منڈوا دیے جاتے تھے۔ یہ غلامی کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ چونکہ حج خدا کی دائمی غلامی اور بندگی کا اقرار و اعتراف ہے اس لیے انسانیت کی یہ پرانی رسم باقی رکھی گئی۔'' (سیرۃ النبیؐ جلد ۵، صفحہ ۳۶۴)

شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ نے حلق کے بارے میں یوں اظہار خیال فرمایا ہے:

''حلق کا راز یہ ہے کہ اس سے احرام سے نکلنے کا ایک ایسا طریقہ متعین ہوتا ہے جو وقار کے منافی نہیں ہے۔ اگر لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو ہر شخص جو طریقہ چاہتا اختیار کر لیتا۔ اس کے علاوہ اس میں پراگندہ بال اور ژولیدہ سر ہونے کی حالت کا خاتمہ ہے جو پہلے مطلوب تھی یہ ایسا ہے جیسا نماز میں سلام پھیرنا۔'' (حجۃ اللہ البالغہ)

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ احرام کی حیثیت گویا تکبیر تحریمہ کی ہے جس سے نماز شروع کی جاتی ہے۔ ایسے ہی شاہ صاحب کے فرمان کے مطابق حلق کی حیثیت گویا سلام پھیرنے

کی ہے جس سے نماز ختم ہوتی ہے۔ کیونکہ حلق کے بعد احرام اتار دیا جاتا ہے اور ساتھ ہی وہ سب پابندیاں بھی ختم ہو جاتی ہیں جو احرام کے ساتھ تھیں۔ اب انسان نہائے دھوئے، جیسے کپڑے چاہے پہن لے، خوشبو لگائے وغیرہ وغیرہ۔ تاہم یہ یاد رکھنا ہے کہ احرام کی پابندیاں تو ختم ہو گئی ہیں مگر حج کے بعض مناسک ابھی باقی ہیں۔ مثلاً طواف کرنا اور سعی کرنا اور جمرات کو کنکر مارنا اور منیٰ میں چند دن گزارنا۔

حلق کے بارے میں ایک اور رائے بھی ظاہر کی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ جب کوئی مسلمان بچہ پیدا ہوتا ہے تو ساتویں دن اس کے بال اتروا دیے جاتے ہیں۔ گویا اس دنیا میں زندگی کا آغاز کرتے ہوئے اس کے پہلے والے بال علیحدہ کر دیے جاتے ہیں۔ اب جب کوئی شخص حج کر لیتا ہے تو خدا تعالیٰ اس کے پہلے سب گناہ معاف کر کے اسے ویسا ہی پاک صاف کر دیتا ہے جیسا وہ اس وقت تھا، جب وہ بچے کی شکل میں اس دنیا میں آیا تھا۔ اب حج کے بعد اس حاجی نے بھی بچے کی طرح ایک بالکل نئی زندگی کا آغاز کرنا ہے۔ چنانچہ اس نئی زندگی کے آغاز ہی میں اس کے پرانے بال اتار دیے جاتے ہیں جیسے اس کے بال اس وقت اتارے گئے تھے جب اس نے بچے کی حیثیت سے پہلی بار زندگی کا آغاز کیا تھا۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ۔

واضح رہے کہ بال منڈوانے یا سارے بال ترشوانے کا حکم صرف مردوں کے لیے ہے۔ عورتوں کے لیے اتنا کافی ہے کہ ذرا سے بال کاٹ کر رسم پوری کر لیں۔

طواف: اب حاجی کے لیے ضروری ہے کہ کچھ دیر کے لیے مکہ مکرمہ جائے اور جا کر خانہ کعبہ کا طواف کرے اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرے۔ یہ مناسک ادا کر کے اس نے پھر منیٰ واپس آ جانا ہوگا۔

لغت میں طواف کے معنی ہیں کسی چیز کے اردگرد چکر لگانا اور شرعی اصطلاح میں

طواف سے مراد ہے خانہ کعبہ کے اردگرد والہانہ گھومنا اور چکر لگانا۔

طواف کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ حجر اسود کو چوم کر وہاں سے دائیں طرف طواف شروع کیا جاتا ہے۔ ایک چکر پورا کر کے دوبارہ جب حجرِ اسود آ جائے تو پھر اسے چوما جائے اور دوسرا چکر پورا کیا جائے۔ طواف کے ہر چکر کو ایک ''شوط'' کہا جاتا ہے۔ اسی طرح جب سات ''شوط'' پورے ہو جائیں گے تو ایک طواف ہوگا۔ ہر چکر میں ''استلام'' کرنا ہے۔ استلام یہ ہے کہ حجر اسود کو چومنا ہے اور خانہ کعبہ کے جنوب مغربی کونے کو جسے ''رکن یمانی'' کہا جاتا ہے' چھونا ہے۔ خانہ کعبہ کے باقی دو کونوں (رکن عراقی اور رکن شامی) کو نہ بوسہ دیا جاتا ہے نہ چھوا جاتا ہے۔ ذیل کی حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ حجر اسود اور رکن یمانی کا استلام کتنے اجر و ثواب کا باعث ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن عبید بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے (حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ سے) عرض کیا کہ اے ابوعبدالرحمٰن' میں دیکھتا ہوں کہ آپ صرف ان دو کونوں ہی کا استلام کرتے ہیں (یعنی حجر اسود اور رکن یمانی کا) حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ ان دونوں کا استلام کرنا گناہ کو مٹاتا ہے اور میں نے آپؐ کو یہ بھی فرماتے سنا کہ جو شخص سات بار طواف کرے گویا اس نے ایک غلام آزاد کیا۔ (نسائی)

حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حجرِ اسود کے بارے میں فرمایا۔ خدا کی قسم' اللہ اسے قیامت کے دن ضرور اٹھائے گا (اور یہ اس حالت میں ہوگا کہ) اس کی دو آنکھیں ہوں گی' جن سے یہ دیکھے گا اور ایک زبان ہوگی' جس سے یہ بات کرے گا اور جس نے اسے حق کے ساتھ چوما ہوگا' اس پر گواہی دے گا۔ (ترمذی)

استلام کے بارے میں یہ جان لینا ضروری ہے کہ اگر لوگوں کی کثرت کے باعث حجرِ اسود کو چوما نہ جا سکے تو اس بات کی اجازت ہے کہ ہاتھ سے حجرِ اسود کو چھو کر اس ہاتھ کو چوم لیا جائے۔ لیکن اگر ایسا کرنا بھی دشوار ہو تو چھڑی، لکڑی یا کسی اور چیز سے حجرِ اسود کو چھوا جائے اور پھر اس چیز کو چوم لیا جائے اور اگر انسان حجرِ اسود کے اتنا قریب جا ہی نہ سکے کہ اسے کسی چیز سے چھو سکے یا اگر قریب ہو بھی تو بھی صورتِ حالات ایسی ہو کہ انسان اسے کسی چیز سے نہ چھو سکے تو پھر اس بات کی بھی اجازت ہے کہ ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو اس طرف کر کے اور ہاتھوں کو کانوں تک اٹھا کر ہاتھوں کو چوم لیا جائے۔

یہاں اس کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ حجرِ اسود کو چومنے کا مطلب یہ نہیں کہ اس پتھر میں نعوذ باللہ کوئی ذاتی کرامت ہے بلکہ یہ تو صرف رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں کیا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس بات کو بالکل صاف کر دیا ہے۔

عباس بن ربیعہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ حجرِ اسود کے پاس آئے اور اسے بوسہ دیا اور (حجرِ اسود کو مخاطب کر کے) فرمایا کہ میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے (بس) نہ تو نقصان دے سکتا ہے نہ نفع پہنچا سکتا ہے۔ اگر میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے چومتے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے نہ چومتا۔ (بخاری)

طواف کر لینے کے بعد مقامِ ابراہیمؑ کی طرف جا کر دو رکعت نماز پڑھی جاتی ہے۔ اس طرح گویا ایک طواف مکمل ہوتا ہے۔ یعنی ایک طواف کرنے کے لیے خانہ کعبہ کے گرد سات چکر لگائے جائیں اور ممکن ہو تو ہر چکر میں حجرِ اسود اور رکنِ یمانی کا استلام کیا جائے۔ اور آخر میں مقامِ ابراہیمؑ پر دو رکعت نماز پڑھی جائے۔

طواف حج کی ایک خاص اور بہت زیادہ فضیلت والی عبادت ہے۔ طواف کئی اقسام کا ہوتا ہے مثلاً:

۱۔ طوافِ قُدوم: یہ وہ طواف ہے جو مکہ مکرمہ میں داخل ہو کر سب سے پہلے کیا جاتا ہے۔ اس کو طواف تحیّہ بھی کہتے ہیں اور اس کا ایک اور نام "طواف اللقاء" بھی ہے۔

۲۔ طوافِ زیارت: یہ وہ طواف ہے جو حج کے دوران ۱۰ ذوالحجہ کو منیٰ سے مکہ مکرمہ آ کر کیا جاتا ہے۔ یہ حج کے ارکان میں سے ایک رکن ہے اور بہت ضروری ہے۔ اس کا نام "طوافِ حج" اور "طواف افاضہ" بھی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی وجہ سے یہ طواف دس ذوالحجہ کو نہ کر سکے تو گیارہ یا بارہ تاریخ کو بھی کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ طوافِ وداع: یہ وہ طواف ہے جو مکہ مکرمہ سے رخصت ہوتے وقت آخری طواف کیا جاتا ہے۔ یہ طواف کر کے التزام سے چمٹ کر سینہ اور داہنا رخسار اس کے ساتھ لگا کر انتہائی گریہ وزاری اور خشوع وخضوع سے دعا کرنی چاہیے۔ یہ خدا کے گھر سے رخصت ہونے کا وقت ہے، خدا جانے یہ سعادت پھر کب نصیب ہو یا نہ ہو۔

۴۔ طوافِ عمرہ: یہ وہ طواف ہے جو عمرہ کرتے ہوئے کیا جاتا ہے۔ یہ عمرے کا رکن ہے۔ اس کے بغیر عمرہ ادا نہیں ہوتا۔

۵۔ طوافِ نذر: یعنی وہ طواف جس کی نذر مانی ہوئی ہو۔ جس طواف کی نذر مانی ہوئی ہو وہ واجب ہو جاتا ہے۔

۶۔ نفلی طواف: یہ طواف کسی وقت بھی کیا جا سکتا ہے۔ دن ہو یا رات، صبح ہو یا شام، نفلی طواف ہر وقت ہو سکتا ہے اور جب تک انسان مکہ مکرمہ میں ہو یہ اس کی عظیم سعادت ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ نفلی طواف کرے۔ کیوں کہ مکہ مکرمہ میں فرائض کے بعد سب سے بڑی عبادت خانہ کعبہ کا طواف ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

کہ" خانہ کعبہ کے گرد طواف کرنا نماز (پڑھنے ہی) کی مانند ہے' سوائے اس کے کہ (نماز میں تم بول نہیں سکتے مگر) اس میں تم بولتے ہو۔ پس (تم میں سے) جو کوئی طواف کرتے ہوئے بات کرے تو اسے چاہیے کہ اچھی بات ہی کرے۔" (ترمذی)

ترمذی ہی میں حضورؐ کی ایک اور حدیث بیان ہوئی ہے جس کے آخر میں آپؐ طواف کرنے والے کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

"..... جب وہ ایک قدم رکھتا اور ایک قدم اٹھاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا ایک گناہ دور کرتا ہے اور اس کے لیے ایک نیکی لکھ لیتا ہے۔ (ترمذی)

اگر کوئی شخص بیماری' بڑھاپے یا کمزوری وغیرہ کسی عذر کے باعث چل کر طواف نہ کر سکے تو سوار ہو کر طواف کرنے کی اجازت ہے۔

سعی: طواف کے بعد اب صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی جائے گی۔ صحیح بخاری میں صفا مروہ کی سعی کے بارے میں حضرت عائشہؓ کی ایک تفصیلی روایت بیان ہوئی ہے جس میں وہ فرماتی ہیں:

"..... رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کے درمیان طواف کرنے کو سنت قرار دیا ہے اور کسی کو اختیار نہیں کہ وہ ان کے درمیان طواف کرنا ترک کر دے....."

طواف سے یہاں مراد وہی صفا اور مروہ کے درمیان سات دفعہ پھرنا ہے جسے سعی کہا جاتا ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ تشریف لائے تو آپؐ خانہ کعبہ کے گرد سات دفعہ گھومے' پھر مقام ابراہیمؑ کے پیچھے دو رکعت نماز ادا کی۔ پھر صفا کی طرف نکلے' اس دروازے سے جس سے کہ آپؐ نکلا کرتے تھے۔ پھر آپؐ نے صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی۔ (نسائی)

اسلام سے پہلے عرب ایک بت پرست قوم تھی اور عام بت پرست قوتوں کی طرح وہ بھی ایک یا چند ایک بتوں کی نہیں بلکہ بے شمار بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ کلام پاک اور احادیثِ نبویہ میں ان کے جن بتوں کے نام ملتے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں۔

ہُبل، وَدّ، سُواع، یَغُوث، یَعُوق، نَسر، لات، منات، اَساف، نائلہ وغیرہ وغیرہ۔

بت پرستی نے ان کی ذہنیت اتنی خراب کر دی تھی کہ خانہ کعبہ کو خدا کا گھر جانتے ہوئے بھی انہوں نے اس کے اندر بت لا رکھے تھے۔ ایسے ہی انہوں نے صفا اور مروہ پر بھی دو بت ''اساف'' اور ''نائلہ'' رکھے ہوئے تھے۔ سورۃ البقرہ آیت ۱۵۸ میں صفا اور مروہ کے متعلق فرمایا گیا ہے۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ	''یقیناً صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے
اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ	ہیں۔ لہٰذا جو شخص خانہ کعبہ کا حج یا عمرہ کرے
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ	اس کے لیے کوئی گناہ کی بات نہیں کہ وہ ان
بِهِمَا ط	دونوں پہاڑیوں کے درمیان سعی کر لے۔''

اس آیت سے بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوگئی۔ انہوں نے سوچا کہ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ اگر ان دونوں کے درمیان سعی کر لو تو یہ کوئی گناہ کی بات نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سعی کرنا زیادہ ضروری نہیں، اگر نہ بھی کریں تو بھی کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ ایک صحابیؓ نے یہ بات حضرت عائشہؓ سے کی تو انہوں نے فرمایا کہ تمہیں غلطی لگی ہے۔ بات یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں انصار ''منات'' بت کے نام پر احرام باندھا کرتے تھے جس کی وہ پوجا کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ جو منات کے نام پر احرام باندھتے تھے، صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنے کو برا سمجھتے تھے، کیونکہ ان پر ''اساف'' اور ''نائلہ'' کے آستانے بنے تھے۔ جب یہ لوگ مسلمان ہو گئے تو انہوں نے حضورؐ سے اس کے بارے میں سوال کیا اور عرض کیا کہ ہم تو صفا مروہ کے درمیان

سعی کرنے کو برا سمجھتے رہے ہیں۔ ان کی بات کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی کہ ان پہاڑیوں کے درمیان سعی کرنا گناہ کی بات نہیں' یہ تو اللہ کے شعائر میں سے ہیں۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''صفا اور مروہ مسجد حرام کے قریب دو پہاڑیاں ہیں' جن کے درمیان دوڑنا منجملہ ان مناسک کے تھا جو اللہ تعالیٰ نے حج کے لیے حضرت ابراہیمؑ کو سکھائے تھے۔ بعد میں جب مکے اور آس پاس کے تمام علاقوں میں مشرکانہ جاہلیت پھیل گئی تو صفا پر ''اساف'' اور مروہ پر ''نائلہ'' کے استھان بنا لیے گئے اور ان کے گرد طواف ہونے لگا۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اسلام کی روشنی اہل عرب تک پہنچی تو مسلمانوں کے دلوں میں یہ سوال کھٹکنے لگا کہ آیا صفا اور مروہ کی سعی حج کے اصلی مناسک میں سے ہے یا محض زمانۂ شرک کی ایجاد ہے اور یہ کہ اس سعی سے کہیں ہم ایک مشرکانہ فعل کے مرتکب تو نہیں ہو جائیں گے۔ نیز حضرت عائشہؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ مدینہ کے دلوں میں پہلے ہی سے سعی بین الصفا والمروہ کے بارے میں کراہت موجود تھی۔ کیونکہ وہ ''مناۃ'' کے معتقد تھے اور اساف و نائلہ کو نہیں مانتے تھے۔ انہیں وجوہ سے ضروری معلوم ہوا کہ مسجدِ حرام کو قبلہ مقرر کرنے کے موقع پر ان غلط فہمیوں کو دور کر دیا جائے جو صفا اور مروہ کے بارے میں پائی جاتی تھیں اور لوگوں کو بتا دیا جائے کہ ان دونوں مقامات کے درمیان سعی کرنا حج کے اصلی مناسک میں سے ہے اور یہ کہ ان مقامات کا تقدس خدا کی جانب سے ہے نہ کہ اہلِ جاہلیت کا من گھڑت۔ (تفہیم القرآن' جلد اول' صفحہ ۱۲۷' ۱۲۸)

سعی کا آغاز صفا سے کیا جاتا ہے۔ اس پر چڑھ کر خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے خدا کی حمد و ثنا اور اس کی بڑائی بیان کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں۔ پھر نیچے اتر کر دعا کرتے کرتے مروہ تک پہنچتے ہیں اور وہاں بھی مروہ پر چڑھ کر اور خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے خدا

کی حمد کرتے، تکبیر کرتے اور دعا کرتے ہیں۔ پھر اسی طرح صفا کی طرف واپس آتے ہیں۔ ساتواں یعنی آخری پھیرا مروہ پر جا کر ختم ہوگا۔

صفا اور مروہ کے درمیان مروہ کی طرف جاتے ہوئے بائیں جانب کو دو سبز نشان ہیں۔ انہیں "مِیلَیْنِ اَخْضَرِیْن" کہتے ہیں۔ ان کے درمیان دوڑنا سنت ہے مگر یہ صرف مردوں کے لیے ہے۔ عورتوں کو یہی حکم ہے کہ ان نشانوں کے درمیان بھی عام معمولی رفتار ہی سے چلیں۔

اگر کوئی شخص بیمار یا اتنا کمزور ہو کہ اس کے لیے پیدل چل کر سعی کرنا دشوار ہو تو اسے اجازت ہے کہ سوار ہو کر سعی کر لے۔ وہاں بچہ گاڑیوں کی قسم کی گاڑیوں کا بندوبست ہوتا ہے۔ کمزور لوگوں کو ان میں بٹھا کر سعی کرا دیتے ہیں۔

زمزم: مسجد حرام میں ایک اور کام جو زائر حرم کے لیے باعث ثواب ہے، وہ یہ ہے کہ زمزم کا پانی شکم سیر ہو کر پیئے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو بہت پسند فرمایا ہے کہ زمزم کا پانی اس طرح پیٹ بھر کر پیا جائے کہ پسلیاں تن جائیں۔

محمد بن عبدالرحمٰنؒ بن ابی بکرؒ بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص ان کے پاس آیا۔ انہوں نے اس سے پوچھا کہ تم کہاں سے آئے ہو۔ اس نے کہا، زمزم کے پاس سے۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا تم نے اس کا پانی اس طرح پیا ہے جیسے کہ پینا چاہیے۔ اس شخص نے دریافت کیا کہ کیسے پینا چاہیے؟ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جب تو زمزم کا پانی پیئے تو قبلہ رخ ہو جا اور اللہ کا نام لے اور (پیتے ہوئے) تین بار دم لے اور خوب سیر ہو کر پی، اور جب پینے سے فارغ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی تعریف کر۔ کیونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ہمارے اور منافقوں کے درمیان نشان (یعنی امتیازی فرق) یہ ہے کہ وہ خوب سیر ہو کر زمزم کا پانی نہیں پیتے۔ (ابن ماجہ)

ایامِ تشریق: طواف، سعی وغیرہ سے فارغ ہو کر حاجی واپس منیٰ چلے جاتے ہیں جہاں ایامِ تشریق گزارنا ہوتے ہیں۔ ایامِ تشریق تین دن ہیں یعنی گیارہ تاریخ سے لے کر تیرہ تاریخ تک۔ ویسے اگر کوئی بارہ تاریخ ہی کو منیٰ سے واپس آنا چاہے تو اسے آنے کی اجازت ہے۔ ایامِ تشریق کے دوران روزانہ جا کر تینوں جمرات کو سات سات کنکر مارے جاتے ہیں اور ان دنوں کو ذکر و عبادت کرنے کے اور کھانے پینے کے دن قرار دیا گیا ہے۔

ابو داؤد میں حضورؐ کی ایک حدیث بیان ہوئی ہے جس کے آخر میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

اِنَّ هٰذِهِ الْاَيَّامَ اَيَّامُ اَكْلٍ وَّشُرْبٍ وَّذِكْرِ اللّٰهِ.

"بیشک یہ دن کھانے پینے کے اور اللہ کی یاد کے دن ہیں۔"

سورۃ البقرہ، آیت ۲۰۳ میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ط فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ج وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ لا لِمَنِ اتَّقٰى ط

یہ گنتی کے چند روز ہیں جو تمہیں اللہ کی یاد میں بسر کرنے چاہئیں۔ پھر جو کوئی جلدی کر کے دو ہی دن میں واپس ہو گیا تو کوئی حرج نہیں اور جو کچھ دیر زیادہ ٹھہر کر پلٹا تو بھی کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ یہ دن اس نے پرہیزگاری کے ساتھ بسر کیے ہوں۔

اسلام سے پہلے رواج تھا کہ حج کے بعد عرب منیٰ میں جلسے کرتے جن میں ہر قبیلے کے لوگ اپنے باپ دادوں کے کارنامے فخر کے ساتھ بیان کرتے اور اپنی بڑائی کی ڈینگیں مارتے تھے۔ چنانچہ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ ان گنتی کے چند دنوں کو فضولیات پر صرف کرنے کے بجائے یادِ الٰہی میں بسر کرو۔ نیز یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ جو دو دن رہنا

چاہے دو دن رہے، جو تین دن رہنا چاہے تین دن رہے، اصل اہمیت اس کی نہیں کہ کوئی شخص کتنے دن رہا بلکہ اس کی ہے کہ جتنے دن بھی وہ رہا اس نے پرہیز گاری اختیار کیے رکھی یا نہیں۔

رخصتی: ایام تشریق کے بعد اب صرف ایک کام رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ مکہ مکرمہ سے رخصت ہوتے وقت ''طواف وداع'' کیا جائے۔ یہ گویا خانہ کعبہ سے آخری ملاقات ہوتی ہے۔ اس میں ملتزم سے چمٹ کر صدق دل سے رو رو کر دین و دنیا کی بہتری کی دعائیں کرنا چاہئیں اور یہ بھی دعا کرنی چاہیے کہ جہاں خدا نے گذشتہ گناہوں کو معاف فرما دیا ہے وہاں وہ اب آئندہ گناہوں سے محفوظ بھی رکھے اور جب اپنے پاس بلائے تو ایمان اور نیکی ہی کی حالت میں بلائے، آمین ثم آمین۔

اب آخر میں مناسک حج کا خلاصہ سا ذہن نشین کر لینا مفید ہوگا، جو حسب ذیل ہے۔

۸ ذوالحجہ کو حج کی نیت کر کے احرام باندھ کر تلبیہ کرتے ہوئے منیٰ جانا۔

منیٰ میں ۹ ذوالحجہ کی صبح تک قیام کرنا،

۹ ذوالحجہ کو تلبیہ کرتے ہوئے منیٰ سے عرفات جانا،

عرفات میں زوال سے غروب آفتاب تک ٹھہرنا اور ذکر و استغفار اور دعا کرنا۔

۹ اور ۱۰ کی درمیانی رات مزدلفہ میں کاٹنا۔

دس تاریخ کو منیٰ واپس آنا، جمرۂ عقبیٰ کی رمی کرنا، قربانی کرنا، بال اتروانا، احرام اتار دینا، طواف زیارت اور سعی کرنا۔

گیارہ، بارہ اور تیرہ تاریخ کو منیٰ میں ٹھہر کر عبادت کرنا اور ہر روز تینوں جمرات کو کنکر مارنا۔

بارہ یا تیرہ تاریخ کو منیٰ سے واپس آجانا۔

یہ وہ مناسک ہیں جن کے مجموعے کو "حج" کہا جاتا ہے۔

عمرہ: "عمرہ" کے معنی ہیں "آباد مکان کا ارادہ کرنا" "زیارت کرنا" اور شریعت کی اصطلاح میں عمرہ وہ چھوٹا حج ہے جو ہر زمانے میں ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے کوئی خاص مہینہ یا خاص تاریخیں معین نہیں، جب جی چاہے عمرہ کر لیا جائے۔ عمرے کے اعمال صرف یہ ہیں کہ احرام باندھا جائے، خانہ کعبہ کا طواف کیا جائے، صفا مروہ کی سعی کی جائے اور بعد میں بال اتروا دیے جائیں۔ خواتین صرف تھوڑے سے بال کاٹ لیں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ. (البقرہ: ۱۹۶) (اور اللہ کی رضا کے لیے حج اور عمرہ پورا کرو)

احادیث میں عمرے کی بھی بہت فضیلت آئی ہے۔ خصوصاً رمضان میں عمرہ کرنے کی۔

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ایک عمرے کے بعد دوسرا عمرہ کرنا ان سب گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے جو ان دونوں عمروں کے درمیان کیے گئے ہوں اور حج مبرور کا صلہ صرف جنت ہے۔" (بخاری)

"حج مبرور" کا مطلب ہے وہ حج جس کے دوران گناہ نہ کیا گیا ہو۔

حضورؐ نے ایک انصاری خاتون سے فرمایا کہ "جب رمضان آئے تو عمرہ کر لینا، کیونکہ رمضان میں عمرہ کرنا حج کے برابر ہے۔" (مسلم)

زیارتِ مدینہ

ویسے تو آٹھ تاریخ سے لے کر بارہ یا تیرہ تاریخ تک سے تعلق رکھنے والے مناسکِ حج ادا کر لینے سے حج مکمل ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ انسان کی بے نصیبی ہے کہ وہ حج کو جائے اور پھر مسجد نبویؐ کی زیارت کیے بغیر واپس آ جائے۔ لہٰذا غالب اکثریت انہیں لوگوں کی ہوتی ہے جو حج کے ساتھ زیارت مدینہ کو ضرور جاتے ہیں۔ خود رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ حضورؐ نے اسی بات کو پسند فرمایا ہے کہ حج کرنے والے حضورؐ کے پاس بھی حاضر ہوں۔

مدینہ منورہ اور مسجد نبویؐ کی فضیلت و عظمت اسی سے ظاہر ہے کہ یہ مبارک شہر حضورؐ کی طرف منسوب ہے اور اس بابرکت مسجد کو حضورؐ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے تعمیر کیا۔

فضیلت مدینہ: مدینہ منورہ کا اصلی نام "یثرب" تھا۔ جب حضورؐ نے یہاں ہجرت فرمائی تو لوگ اسے "مدینۃ النبیؐ" کہنے لگے جس کا مطلب ہے "نبیؐ کا شہر"۔ آہستہ آہستہ یہ نام محض "مدینہ" رہ گیا۔

جب انسان اپنا آبائی وطن چھوڑ کر کسی نئی جگہ جا کر آباد ہو تو ایک مدت تک اس کا وہاں دل نہیں لگتا اور وطن کی یاد ستاتی رہتی ہے۔ یہی حال صحابہ کرامؓ کا بھی ہوا۔ پھر جب یہ لوگ مدینے پہنچے تو وہاں کوئی بیماری بھی پھیلی ہوئی تھی یا ان لوگوں کو وہاں کی آب و ہوا موافق

نہ آئی' لہٰذا کئی صحابہؓ بیمار بھی ہو گئے۔ اس پر حضورؐ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مہاجرین کے دلوں میں مدینے کی محبت پیدا ہو جائے اور انہیں وہاں کی آب و ہوا موافق آ جائے اور ان کے رزق میں برکت ہو۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب ہم مدینے آئے تو وہ ایک وبائی سرزمین تھی۔ سو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت بلالؓ بیمار ہو گئے۔ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کی بیماری ملاحظہ فرمائی تو آپؐ نے دعا فرمائی۔ ''اے خدا' جس طرح تو نے ہمیں مکے کی محبت عطا فرمائی تھی' اسی طرح ہمیں مدینے کی محبت عطا فرما' یا اس سے بھی زیادہ (محبت عطا فرما) اور یہاں کی آب و ہوا صحت بخش بنا دے اور ہمارے ''صاع'' اور ''مد'' میں برکت عطا فرما اور یہاں کے بخار کو جحفہ کی (سرزمین کی طرف) منتقل فرما دے۔'' (مسلم)

''صاع'' اور ''مُد'' وہاں کے پیمانے تھے۔ صاع اور مد میں برکت کا مطلب روزی میں برکت ہے۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ہم رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے جب ہم ''سُقیا'' کی پتھریلی زمین میں پہنچے جو حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی تھی تو حضورؐ نے فرمایا کہ میرے پاس وضو کا پانی لاؤ۔ پھر آپؐ نے وضو کیا اور قبلہ رخ ہو کر کھڑے ہو گئے اور دعا کی۔ ''اے اللہ' ابراہیمؑ تیرے بندے اور تیرے خلیل تھے' اور انہوں نے اہلِ مکہ کے لیے برکت کی دعا کی تھی اور میں (بھی) تیرا بندہ اور تیرا رسولؐ ہوں۔ میں تجھ سے اہلِ مدینہ کے لیے دعا کرتا ہوں کہ تو ان کے ''مد'' اور ان کے ''صاع'' میں اس سے دگنی برکت عطا کر جتنی تو نے مکے والوں کو عطا کی' ہر برکت کے ساتھ دو برکتیں عطا فرما۔'' (ترمذی)

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ لوگ جب (موسم کا) پہلا پھل دیکھتے تو اسے لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ جب حضورؐ اسے لیتے تو فرماتے: اے اللہ'

ہمیں ہمارے پھلوں میں برکت دے اور ہمیں ہمارے مدینے میں برکت دے اور ہمیں ہمارے "صاع" میں برکت دے اور ہمیں ہمارے "مد" میں برکت دے۔ اے اللہ! ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام تیرے بندے اور تیرے خلیل اور تیرے نبی تھے اور بے شک میں (بھی) تیرا بندہ اور تیرا نبیؐ ہوں۔ انہوں نے تجھ سے مکے کے لیے دعا کی تھی تو جتنی انہوں نے مکے کے لیے دعا کی تھی' اتنی' اور اس کے برابر اور بھی' میں تجھ سے مدینے کے لیے دعا کرتا ہوں۔ حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ پھر حضورؐ اپنے سب سے چھوٹے بچے کو بلاتے اور وہ پھل اسے عطا فرما دیتے۔ (مسلم)

اس حدیث کی تشریح میں بتایا گیا ہے کہ "اپنے سب سے چھوٹے بچے" سے مراد یہ ہے کہ حضورؐ اہل بیت کے بچوں میں سب سے چھوٹے بچے کو بلا کر وہ پھل اسے عطا فرما دیتے۔ اسی مضمون کی ایک اور حدیث ہے جس کے آخر میں یہ بیان ہوا ہے کہ حضورؐ کی مجلس میں جو بچے حاضر ہوتے ان میں سے سب سے چھوٹے بچے کو وہ پھل عنایت فرما دیتے۔

احادیث سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حضورؐ کو مدینہ منورہ سے اتنی محبت تھی کہ جب سفر سے واپس لوٹتے اور مدینے کے قریب پہنچتے تو جلد مدینے پہنچنے کے لیے اپنی سواری کو تیز کر دیتے۔ جب حضورؐ غزوۂ تبوک کے لیے گئے تو دوسرے صحابہؓ کے علاوہ حضرت ابوحمیدؓ بھی آپؐ کے ساتھ تھے۔ انہوں نے ایک حدیث بیان کی ہوئی ہے' جس کے آخر میں وہ فرماتے ہیں:

".....پھر ہم (واپس) آئے یہاں تک کہ وادی القریٰ میں پہنچے تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں جلدی جانا چاہتا ہوں' پس تم میں سے جو چاہے' وہ میرے ساتھ جلدی چلے اور جو چاہے وہ رُکا رہے۔ اس پر ہم (آپؐ کے ساتھ) چلے۔ یہاں تک کہ جب ہم مدینے کے سامنے آئے تو آپؐ نے فرمایا کہ "یہ طابہ ہے اور یہ (کوہِ) احد ہے' اور

یہ ایک ایسا پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔" (مسلم)

طابہ کا مطلب ہے پاک اور صاف، معطر اور خوشبودار۔

حضرت جابرؓ بن سمرۃ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے مدینے کا نام "طابہ" رکھا ہے۔ (مسلم)

احادیث سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حضورؐ نے مدینہ منورہ کو "حرم" قرار دیا۔

حضرت عبداللہؓ بن زید بن عاصم بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابراہیمؑ نے مکہ مکرمہ کو حرم بنایا تھا اور وہاں کے رہنے والوں کے لیے دعا کی تھی اور میں مدینہ منورہ کو حرم بناتا ہوں جیسے کہ ابراہیمؑ نے مکہ مکرمہ کو حرم بنایا تھا اور جتنی ابراہیمؑ نے مکے والوں کے لیے دعا کی تھی۔ میں نے مدینے کے صاع اور مد کے لیے اس سے دگنی دعا کی ہے۔ (مسلم)

حضرت سہلؓ بن حنیف بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے مدینہ منورہ کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: "بے شک یہ حرم ہے، امن کی جگہ۔" (مسلم)

حضرت ابوسعید خدریؓ نے ایک لمبی حدیث بیان فرمائی ہوئی ہے جس میں وہ بتاتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

"..... اے خدا، ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مکے کو محترم قرار دیا تھا اور اسے حرم بنا دیا تھا اور میں مدینہ منورہ کو حرم قرار دیتا ہوں۔ اس کے دونوں پہاڑوں کے درمیان (کی سرزمین حرم ہے) یہاں خونریزی نہ کی جائے اور یہاں لڑنے کے لیے ہتھیار نہ اٹھائے جائیں اور یہاں کے کسی درخت کو چھانٹا نہ جائے سوائے (اس کے کہ) چارے کے لیے (ضرورت ہو) (پھر حضورؐ نے دعا فرمائی کہ) اے خدا، ہمیں ہمارے مدینے میں

برکت دے' اے خدا ہمیں اپنے صاع میں برکت دے۔ اے خدا' ہمیں ہمارے مدیں برکت دے۔ (پھر دوبارہ فرمایا) اے خدا ہمیں ہمارے صاع میں برکت دے، اے خدا ہمیں ہمارے مد میں برکت دے۔ اے خدا' ہمیں ہمارے مدینے میں برکت دے۔ اے خدا' اس برکت کے ساتھ اور دو برکتیں عطا فرما (اور فرمایا کہ) مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ (تمہاری غیر حاضری میں) مدینے میں کوئی گھاٹی اور کوئی درہ ایسا نہیں ہوتا' جس پر دو فرشتے بیٹھے اس کی حفاظت نہ کرتے ہوں' یہاں تک کہ تم اس کی طرف واپس آجاؤ..... (مسلم)

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مدینہ حرم ہے' جس نے اس میں کوئی بدعت کی یا کسی بدعت کرنے والے کو پناہ دی تو اس پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ قیامت کے دن اس کا نہ کوئی فرض قبول ہوگا اور نہ کوئی نفل۔ (مسلم)

علمائے کرام نے واضح فرمایا ہے کہ حضورؐ کے مدینہ منورہ کو "حرام" کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اسی کی کما حقہٗ عزت و تکریم کی جائے۔ اس کے اندر ممنوع افعال سے پرہیز کی جائے اور اس کی عظمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہاں زندگی گزاری جائے۔ باقی مکہ مکرمہ کی حرمت جس طور پر آئی ہے' ٹھیک اسی طور پر مدینہ منورہ کی حرمت نہیں۔

حضورؐ کو مدینے اور اہل مدینہ کے ساتھ اتنی محبت تھی کہ انہیں تکلیف پہنچانے والوں کے بارے میں آپؐ نے سخت وعید سنائی۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اہل مدینہ کے ساتھ کوئی برائی کرنے کا ارادہ کیا' خدا اسے اس طرح پگھلا دے گا جیسے نمک پانی میں گھل جاتا ہے۔ (مسلم)

حضورؐ نے مدینہ منورہ کے بارے میں جو کچھ فرمایا تھا' اس کا صحابہ کرامؓ پر اتنا اثر تھا کہ وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ مدینے کے اندر کسی جانور کو بھی تکلیف پہنچے۔

حضرت ابوہریرہؓ فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں مدینے کے اندر ہرنیوں کو چرتے دیکھوں تو انہیں کبھی نہ ڈراؤں (اس لیے کہ) رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے دو کالے پتھروں والے میدانوں کے درمیان کا حصہ حرم ہے۔ (مسلم)

صحیح مسلم میں حضرت ابوسعید خدریؓ کے بارے میں بیان ہوا ہے کہ آپؓ جب مدینہ منورہ میں کسی کے ہاتھ میں پرندہ دیکھ لیتے تو اسے اس کے ہاتھ سے لے کر آزاد کر دیتے۔

حضورؐ کی احادیث سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آپؐ نے اہل مدینہ کا مدینہ کے اندر ہی رہنا پسند فرمایا ہے۔ حضورؐ نے پیشین گوئی فرمائی کہ جب مسلمان دوسرے علاقے فتح کر لیں گے تو پھر اہل مدینہ ان علاقوں میں جا کر بسنا شروع کر دیں گے حالانکہ مدینے میں رہنا ان کے لیے بہتر ہوگا۔

عامر بن سعدؓ بیان کرتے ہیں کہ ان کے والد نے بتایا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں مدینے کی دو کالی پتھریلی زمینوں کے درمیانی حصے کو حرم قرار دیتا ہوں۔ یہاں کے خاردار درخت نہ کاٹے جائیں اور نہ یہاں کا شکار قتل کیا جائے اور فرمایا کہ مدینہ اہل مدینہ کے لیے بہتر ہے۔ کاش کہ وہ (اس حقیقت کو) جانتے ہوتے۔ جو شخص مدینے سے بے رغبتی کر کے اسے چھوڑ جائے گا' خدا اس کی جگہ مدینے میں کسی ایسے شخص کو بسائے گا جو اس (چھوڑنے والے) سے بہتر ہوگا اور جو شخص مدینے کی مصیبتوں اور محنت و مشقت پر صبر کرے گا (اور ان تکالیف کے باعث مدینے کو چھوڑ کر نہیں جائے گا) میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کروں گا یا اس کے حق میں گواہی دوں گا۔ (مسلم)

سفیان بن ابی زہیر بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''شام (کا ملک) فتح ہوگا تو بعض لوگ اپنے اہل وعیال کو لے کر سواریاں ہنکاتے ہوئے مدینے سے نکل جائیں گے (اور شام جا پہنچیں گے) حالانکہ مدینہ ان کے لیے بہتر ہوگا۔ کاش کہ وہ (اس حقیقت کو) جانتے ہوتے۔ پھر یمن فتح ہوگا تو بعض لوگ اپنے اہل وعیال کو لے کر سواریاں ہنکاتے ہوئے نکلیں گے (اور یمن جا پہنچیں گے) حالانکہ مدینہ ان کے لیے بہتر ہوگا۔ کاش کہ وہ (اس حقیقت کو) جانتے ہوتے۔ پھر عراق فتح ہوگا تو بعض لوگ اپنے اہل وعیال کو لے کر سواریاں ہنکاتے مدینے سے نکلیں گے (اور عراق جا پہنچیں گے) حالانکہ مدینہ ان کے لیے بہتر ہوگا۔ کاش کہ وہ (اس حقیقت کو) جانتے ہوتے۔'' (مسلم)

فتنے کے زمانے میں ایک دن حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کی ایک آزاد کردہ کنیز آ گئی۔ اس نے انہیں سلام کیا اور عرض کیا کہ اے ابوعبدالرحمٰن! ہم پر زمانہ بہت سخت ہو گیا ہے۔ اس لیے میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ (مدینے سے) چلی جاؤں۔ اس پر حضرت عبداللہؓ نے اس سے کہا۔ اے احمق عورت! یہیں بیٹھی رہ کیونکہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ جو شخص مدینے کی مصیبتوں اور شدتوں پر صبر کرے گا۔ میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کروں گا یا اس کے حق میں گواہی دوں گا۔ (مسلم)

بعض روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حضورؐ نے مدینے کے اندر وفات پانے کو بہت پسند فرمایا۔ لہٰذا حضرت عمرؓ کو یہ تمنا تھی کہ ان کی وفات مدینے کے اندر ہی ہو۔ ساتھ ہی آپؓ کی یہ آرزو بھی تھی کہ آپ شہید ہوں اور بظاہر یہ دونوں خواہشات ایک دوسرے کی ضد تھیں کیونکہ جہاد مدینے سے باہر دوسرے علاقوں میں ہو رہا تھا اور حضرت عمرؓ کے لیے مدینے کے اندر رہنا ضروری تھا۔ مگر اللہ نے ایسا بندوبست فرما دیا کہ آپؓ کی دونوں خواہشیں پوری ہو گئیں۔

ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسی شخص نے خواب میں دیکھا کہ حضرت عمرؓ شہید کر دیے گئے ہیں۔ انہوں نے حضرت عمرؓ سے اس خواب کا ذکر کیا۔ اس پر حضرت عمرؓ حسرت سے بولے کہ بھلا مجھے شہادت کیونکر نصیب ہوگی جبکہ میں جزیرۃ العرب میں رہ رہا ہوں۔ میں خود جہاد میں شریک نہیں ہوتا اور لوگ ہر وقت مجھے گھیرے رہتے ہیں۔ ہاں اگر خدا کو منظور ہوگا تو وہ انہیں حالات میں مجھے شہادت کی سعادت سے نوازے گا' اور اس کے بعد آپ نے یہ دعا فرمائی:

''اے اللہ' مجھے اپنی راہ میں شہادت نصیب کر اور مجھے اپنے رسولؐ کے شہر میں موت دے۔''

آپؓ کی یہ دعا سن کر آپؓ کی صاحبزادی ام المومنین حضرت حفصہؓ نے کہا کہ بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپؓ راہِ خدا میں شہید بھی ہوں اور موت بھی مدینے ہی میں آئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ خدا نے چاہا تو یہ دونوں باتیں ہو جائیں گی۔

چنانچہ جیسے آپ نے فرمایا تھا ویسا ہی ہوا۔ ایک شقی شخص ''ابولؤلؤ'' نے مسجد نبویؐ میں آپ کو زخمی کیا اور اسی زخم سے آپ کو شہادت نصیب ہوگئی۔

مسجدِ نبویؐ: مدینہ منورہ جانے کا اصل مقصد مسجد نبویؐ کی زیارت ہوتا ہے اور مسجد کے اندر ہی حضورؐ کا مدفن پاک بھی ہے جس کے اوپر سبز گنبد بنا ہوا ہے۔ سید سلیمان ندویؒ مسجد نبویؐ کی تعمیر کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

''مدینے میں قیام کے بعد سب سے پہلا کام ایک خانہ خدا کی تعمیر تھی..... دولت کدے کے قریب خاندان نجار کی زمین تھی' جس میں کچھ قبریں تھیں' کچھ کھجور کے درخت تھے۔ آپؐ نے ان لوگوں کو بلا کر فرمایا کہ میں یہ زمین بہ قیمت لینا چاہتا ہوں۔ وہ بولے کہ ہم قیمت لیں گے مگر آپؐ سے نہیں بلکہ خدا سے۔ کیونکہ اصل میں وہ زمین دو یتیم بچوں کی تھی۔

آپؐ نے خود ان یتیموں کو بلا بھیجا۔ ان یتیم بچوں نے بھی اپنی کائنات نذر کرنی چاہی، لیکن آپؐ نے گوارا نہ کیا۔ حضرت ابوایوبؓ (انصاری) نے قیمت ادا کی، قبریں اکھڑوا کر زمین ہموار کر دی گئی اور تعمیر شروع ہوئی۔ شہنشاہ عالم پھر مزدوروں کے لباس میں تھے۔ صحابہؓ پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے تھے اور یہ رجز پڑھتے جاتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ لَا خَیْرَ اِلَّا خَیْرُ الْاٰخِرَۃ
فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَالْمُھَاجِرَۃ.

(اے خدا کامیابی صرف آخرت کی کامیابی ہے پس تو بخش دے انصار کو اور مہاجروں کو)

یہ مسجد ہر قسم کے تکلفات سے بری اور اسلام کی سادگی کی تصویر تھی یعنی کچی اینٹوں کی دیواریں، کھجور کے پتوں کا چھپر اور کھجور کے ستون تھے..... فرش چونکہ کچا تھا، بارش میں کیچڑ ہو جاتی تھی۔ ایک دفعہ صحابہؓ نماز کے لیے آئے تو کنکریاں لیتے آئے اور اپنی اپنی نشست گاہ پر بچھا لیں۔ حضورؐ نے اس بات کو پسند فرمایا اور سنگریزوں کا فرش بنوا دیا۔ مسجد کے ایک طرف ایک مسقف (یعنی چھت والا) چبوترہ تھا، جو صُفّہ کہلاتا تھا، یہ ان لوگوں کے لیے تھا جو اسلام لاتے تھے اور گھر بار نہیں رکھتے تھے۔ (سیرۃ النبیؐ جلد اوّل)

چنانچہ جب حضورؐ نے مسجد بنائی تو وہ اس وقت سادہ شکل و صورت میں تھی۔ مسجد کے ساتھ ہی ازواج مطہرات کے رہنے کے لیے حجرے بھی بنائے گئے اور یہ حجرے بھی کچی اینٹوں اور کھجور سے بنائے گئے تھے۔ پھر جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا، مختلف عہدوں کے بعض مسلمان حکمران اس کی تعمیر میں حصہ لیتے رہے اور اب مسجد نبویؐ بڑی وسیع، بہت شان و شوکت والی اور انتہائی خوبصورت عمارت ہے اور مسجد حرام کے بعد یہ سب سے زیادہ فضیلت والی مسجد ہے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری دینی سرگرمیوں، تعلیم و تربیت، ہدایت و ارشاد اور دعوت و جہاد کا مرکز یہی مسجد تھی اور اس میں ایک نماز پڑھنی کسی دوسری جگہ

ہزار نمازیں پڑھنے سے افضل ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''میری اس مسجد میں ایک نماز ادا کرنا کسی دوسری مسجد میں ہزار نمازیں پڑھنے سے بہتر ہے سوائے مسجد حرام کے۔'' (مسلم)

دنیا کی تمام مساجد محترم ہیں اور جہاں کہیں بھی کوئی مسجد ہے اسے دوسری عمارتوں پر فضیلت حاصل ہے تاہم ان مساجد میں سے تین مساجد کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی فضیلت عطا فرمائی ہوئی ہے۔ ایک مسجد حرام' دوسرے مسجد نبویؐ اور تیسرے بیت المقدس۔ اور حضورؐ نے ہدایت فرمائی ہے کہ ثواب کی نیت سے خاص طور پر سفر کر کے جانا' صرف انہیں تین مساجد کے لیے ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (ثواب کی خاطر) تین مساجد کے علاوہ کسی طرف کجاوے نہ کسے جائیں (یعنی سفر نہ کیا جائے) میری اس مسجد کی طرف اور مسجد حرام کی طرف اور مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) کی طرف۔ (مسلم)

بعض روایات سے مسجد نبویؐ میں ۴۰ نمازیں پڑھنے کی فضیلت کا پتہ چلتا ہے۔ اس لیے عموماً لوگ مدینہ منورہ میں آٹھ دن قیام کرتے ہیں تاکہ چالیس نمازیں پوری ہو جائیں۔

جہاں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا روضہ مبارک ہے۔ یہ پہلے حضرت عائشہؓ کا گھر تھا جو مسجد کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ یہیں آپؐ نے وفات پائی اور اسی مقام پر آپؐ کو دفن کیا گیا۔ یہاں سے لے کر اس جگہ تک جہاں حضورؐ کا منبر ہوتا تھا جس پر آپؐ مسلمانوں کو خطاب فرمایا کرتے تھے' جو قطعہ زمین ہے اسے ''جنت کی کیاری'' کہا جاتا ہے اور اس حصے

پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن زید انصاری بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ "میرے منبر اور میرے گھر کے درمیان کی جگہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔" (مسلم)

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اس جگہ پہنچ گیا' وہ گویا جنت کے ایک باغ میں پہنچ گیا' اس لیے وہ جگہ اس کی مستحق ہے کہ اللہ کی رحمت کے طالبوں کو اس کے ساتھ جنت کی سی دلچسپی ہو۔

مسجد نبویؐ میں ذکر الٰہی' تلاوت قرآن اور درود شریف پڑھنے کے علاوہ ایک اور دل پسند عمل جو صرف اسی مسجد کے ساتھ وابستہ ہے یہ ہے کہ حضورؐ کے روضہ پاک کے سامنے کھڑے ہو کر حضورؐ کو سلام کیا جائے۔

اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ — اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) آپؐ پر سلام

وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ — اور خدا کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں۔

حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ آپؓ کی عادت تھی کہ جب کبھی سفر سے واپس آتے تو سب سے پہلے روضہ اقدس پر حاضر ہوتے اور حضورؐ کی جناب میں درود و سلام پڑھتے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ آپؒ کی عادت تھی کہ جب کبھی سفر سے واپس آتے تو سب سے پہلے روضہ اقدس پر حاضر ہوتے اور حضورؐ کی جناب میں درود و سلام پڑھتے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے متعلق بتایا گیا ہے کہ خاص طور پر شام سے ایک قاصد روانہ کیا کہ جا کر دربار رسالت میں ان کا سلام پہنچائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مدفن پاک میں دو اور مزار بھی ہیں۔ ایک خلیفہ اوّل حضرت ابوبکرؓ صدیق کا اور دوسرا خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کا۔ حضورؐ کو سلام کرنے کے بعد ان دونوں بزرگوں کے مزاروں کے سامنے کھڑے ہو کر وہ مسنون سلام عرض کیا جاتا ہے، جو زیارتِ قبور کے لیے مسلمان کو سکھایا گیا ہے۔

اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا اَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَاِنَّا اِنْشَآءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُوْنَ نَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ.

(اے مومن اور مسلمان گھر والو! تم پر سلامتی ہو اور ہم انشاء اللہ تم سے ملنے والے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے اور تمہارے لیے عافیت مانگتے ہیں)

وَتَزَوَّدُوْا.....

(اور زادِراہ ساتھ لے جاؤ)

سورۃ البقرہ آیت ۱۹۷ میں فرمایا گیا ہے:

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى. (اور (سفر حج کے لیے) زادِ راہ ساتھ لے جاؤ اور سب سے بڑا زادِراہ پرہیزگاری ہے)

''جاہلیت کے زمانے میں حج کے لیے زادِراہ ساتھ لے کر نکلنے کو ایک دنیادارانہ فعل سمجھا جاتا تھا اور ایک مذہبی آدمی سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ خدا کے گھر کی طرف دنیا کا سامان لیے بغیر جائے گا۔ اس آیت میں ان کے اس غلط خیال کی تردید کی گئی ہے اور انہیں بتایا گیا ہے کہ زادِراہ نہ لینا کوئی خوبی نہیں ہے۔ اصل خوبی خدا کا خوف اور اس کے احکام کی خلاف ورزی سے اجتناب اور زندگی کا پاکیزہ ہونا ہے، جو مسافر اپنے اخلاق درست نہیں رکھتا اور خدا سے بے خوف ہو کر برے اعمال کرتا ہے وہ اگر زادِراہ ساتھ نہ لے کر محض ظاہر میں فقیری کی نمائش کرتا ہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ خدا اور خلق دونوں کی نگاہ میں وہ ذلیل ہوگا اور اپنے اس مذہبی کام کی بھی توہین کرے گا جس کے لیے وہ سفر کر رہا ہے۔ لیکن اگر اس کے دل میں خدا کا خوف ہو اور اس کے اخلاق درست ہوں تو خدا کے ہاں بھی اس کی عزت ہوگی اور خلق بھی اس کا احترام کرے گی، چاہے اس کا توشہ دان کھانے سے بھرا ہوا ہو۔''

(تفہیم القرآن، جلد اوّل)

لہٰذا حج کا سفر کرتے ہوئے ضروری سامان ساتھ لے لینا چاہیے تاکہ انسان بے وجہ پریشانی میں مبتلا نہ ہو اور اصل زادِراہ' جیسے کہ مندرجہ بالا آیت واضح کر رہی ہے' یہی ہے کہ انسان گناہوں اور ناپسندیدہ افعال سے بچے--- زادِراہ کیوں ساتھ لے جایا جاتا ہے آخر؟----- اسی لیے تو لے جایا جاتا ہے کہ انسان تکلیف سے دوچار نہ ہو اور یہی مقصد پرہیزگاری پورا کرتی ہے۔ جو شخص اپنے سفر کے دوران غلط حرکات سے بچنے کی کوشش کرتا رہے گا' خالق بھی اپنی مہربانی سے' اس کی منزل آسان کرے گا اور مخلوق بھی اگر اس کی راہ میں آسانیاں بہم پہنچانے کی کوشش نہ کرے گی تو کم از کم مشکلات پیدا کرنے سے انشاءاللہ ضرور احتراز کرے گی۔

اب زادِراہ ہی کے سلسلے میں یہاں چند باتیں بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے' اس توقع کے ساتھ کہ یہ انشاءاللہ حج کا سفر اختیار کرنے والوں کو فائدہ دیں گی' بشرطیکہ زائرینِ خانہ کعبہ سفر سے پہلے ان کا مفہوم سمجھ لیں۔ زندگی میں بسا اوقات ہمیں ایسے مفید مشورے دیے جاتے ہیں جو ہمیں بہت سی بیکار پریشانی سے بچا سکتے ہیں مگر ہم بروقت ان کا مفہوم نہیں سمجھ پاتے۔ پھر جب خود تجربہ کر کے پریشانی سہہ لیتے ہیں تب سمجھ میں آتا ہے کہ سمجھانے والوں نے کیا سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

عین ممکن ہے کہ مندرجہ ذیل سطور کا بھی وہی حشر ہو اور حج کو جانے والے وقت سے پہلے ان کا صحیح مفہوم نہ سمجھ پائیں۔ یہاں تک کہ جب وہ وہاں سے ہو آئیں اور ان تمام تجربات سے گزر لیں تب ان کی سمجھ میں آئے کہ جانے سے پہلے ان کی خدمت میں کیا عرض کیا گیا تھا۔ تاہم دیانتداری کا تقاضا یہی ہے کہ جس بات کے دوسروں کے لیے مفید ہونے کا ذرا سا بھی امکان ہو وہ ان کے سامنے پیش ضرور کر دی جائے۔

آمدم برسرِ مطلب' یہ دیکھ کر دل بے اندازہ کڑھتا ہے کہ بہت سے حاجی حال

جوش وخروش، مسرت اور ارمانوں کے ساتھ گھر سے نکلتے ہیں مگر وہاں پہنچ کر کچھ اس طرح بے چینیوں، الجھنوں اور اضطراب کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں کہ اس ابتدائی جوش و مسرت کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ کہ کدھر چلا گیا۔ پھر سارا حج اسی بے چینی میں کٹ جاتا ہے بلکہ بعض اوقات گھر واپس آ کر بھی مدتوں وہی چرچے رہتے ہیں کہ یہ تکلیف ہوئی اور وہ تکلیف ہوئی اور فلاں نے ایسے بے مروتی کا سلوک کیا اور فلاں نے اس طرح طوطا چشمی دکھائی۔

ایک بی بی حج کر کے آئیں۔ گلی محلے کی عورتیں مبارک دینے اور وہاں کے حالات سننے کے لیے آ جمع ہوئیں۔ مگر حج کرنے والی خاتون بار بار معلم کے "ظلم وستم" اور اپنے ساتھیوں میں سے بعض کی "بے مروتی" کی داستانیں ہی سناتی رہیں۔ جب بار بار شکوے شکایتیں ہی سنی گئیں تو ایک سیدھی سادی ناخواندہ عورت جو کمال شوق سے حج کی باتیں سننے آئی تھی، بے ساختہ کہہ اٹھی۔ "لو ہم تو اس لیے آئے تھے کہ کچھ نیکی پاکی کی باتیں سنیں گے مگر یہاں بھی وہی کچھ ہو رہا ہے جو ہم سب کرتے ہیں۔"

ایک خاتون اور ان کے میاں حج کے لیے حجاز پہنچے، وہاں سعودی عرب میں ان کے بھائی بھی رہتے تھے، مگر کچھ ایسی گڑبڑ ہوئی کہ انہیں آمد کے ٹھیک وقت کی اطلاع نہ دی جا سکی، لہٰذا کوئی انہیں لینے جدے نہ آیا۔ جدے اتر کر بھائی کے گھر پہنچنے تک انہیں اتنی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا کہ جب آخر وہ بھائی کے دروازے تک پہنچیں تو اپنی آمد کی اطلاع اس طرح دی کہ زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ اندر سے بھائی نے آواز پہچانی اور باہر نکلے تو بہن کھڑی بلند آواز سے رو رہی تھی۔

ایک بڑی دیندار خاتون، جن کے گھرانے میں ہر طرف نماز، روزے اور زکوٰۃ، حج ہی کا چرچا رہتا تھا، حج کو گئیں۔ سعودی عرب کے قیام کے دوران وہ وہاں "نیک رشتے دار خاتون سے ملیں اور بڑی آزردگی سے بولیں۔ "سنا ہوا تو یہ تھا کہ جو حج کے لیے جاتا ہے

اس کے دل میں روشنی آجاتی ہے مگر ہمیں تو چاروں طرف سے صرف دھکے ہی دکھائی دے رہے ہیں۔"!

ایک بڑے صاحب ثروت شخص حج کر کے واپس آئے تو اپنے ایک دوست سے فرمانے لگے۔ "سترہ ہزار روپیہ خرچ کر کے آیا ہوں اور پھر بھی پیٹ پیٹ کر وقت گزارہ ہے۔"

ٹرین کراچی سے پشاور جا رہی تھی۔ سواریوں میں بے شمار لوگ وہ تھے جو حج کر کے واپس آرہے تھے۔ گاڑی جس اسٹیشن پر بھی ٹھہرتی، وہاں کچھ نہ کچھ حاجیوں نے ضرور اترنا ہوتا اور تقریباً ہر اسٹیشن پر ان حاجیوں کا استقبال کرنے والا گروہ پھولوں کے ہار لیے کھڑا ہوتا۔ ایک اسٹیشن پر جب ٹرین رکی اور کچھ حاجی نیچے اترے تو استقبال کرنے والا گروہ پھولوں کے ہار لے کر لپکا۔ ٹرین کے اندر ایک حج کر کے آنے والی لڑکی یہ منظر دیکھ رہی تھی، وہ بے اختیار ہنس دی اور کہنے لگی:

"ذرا ان حاجیوں کو دیکھنا! اب لگے ہیں گلوں میں ہار ڈلوانے اور فخر سے پھول کر کپا ہونے۔ اور وہ جو حج کے دوران تمہاری گت بنتی رہی ہے، وہ بھول گئے ہو کیا!"

غرضکہ بے شمار لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے اس مبارک سفر سے روحانی مسرت حاصل کرنے کے بجائے اپنا قیمتی وقت جزع فزع اور شکووں شکایتوں میں گزارنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان پریشانیوں اور بے چینیوں کی جو بھی وجوہ ہوں، ایک بات تو بالکل ظاہر ہے کہ یہ واویلا حج کو بہت خراب کرتا ہے، بجائے اس کے کہ انسان خدا کا شکر ادا کرے اور مسرور ہو کہ خدا تعالیٰ نے اسے ان مقامات کی زیارت کرنے اور زندگی کا ایک بہت بڑا فرض ادا کر لینے کی سعادت بخشی ہے، وہ اپنی پریشانیوں میں کچھ ایسا الجھ جاتا ہے کہ بما حقہ، شکر ادا کرنے کی طرف بھی متوجہ نہیں ہوتا اور گھر سے چلتے وقت جو خوشی اور مسرت وہ محسوس کر رہا

ہوتا ہے اس کے بالکل برعکس پریشانیوں اور بے چینیوں کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے!

ظاہر ہے کہ سبھی حاجی ایسے نہیں ہوتے۔ بعض لوگ ایسے عقلمند اور سلیم الفطرت ہوتے ہیں جو اپنے اس سفر سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور اس راہ میں آنے والی ناگزیر دقتوں کو خندہ پیشانی سے چپ چاپ برداشت کرتے ہیں' تاہم جزع فزع کر کے اپنے حج کو خراب کرنے والوں کی بھی کمی نہیں ہوتی۔ اب جہاں تک حج کا تعلق ہے وہ تو اللہ رب العالمین اپنی رحمتِ کاملہ سے کام لیتے ہوئے قبول فرما ہی لیتا ہے اور گناہ تو صاف ہو ہی جاتے ہیں مگر انسان نے وہاں کے قیام کے دوران جو روحانی مسرت محسوس کرنی ہوتی ہے اور اپنے اخلاق و اعمال کی اصلاح کے لیے جو طاقت و قوت حاصل کرنی ہوتی ہے' اس میں بڑا نقص واقع ہو جاتا ہے۔

ایسے کیوں ہوتا ہے؟ اپنی ذمہ داریوں کو نظر انداز کر کے اور دور دراز کی مسافتیں طے کر کے انسان وہاں پہنچتا تو اس لیے ہے کہ اس کا فرض ادا ہو۔ اس کے گناہ معاف ہوں اور اسے روحانی پاکیزگی اور اخلاقی بلندی نصیب ہو' مگر وہاں پہنچ کر ان ضروری کاموں کی طرف متوجہ رہنے کے بجائے وہ بے چینیوں' الجھنوں اور اضطراب کا لقمہ بن جاتا ہے---- اس کی کیا وجہ ہے؟

حج کرنے والوں کی ان پریشانیوں پر غور کریں تو ماننا پڑتا ہے کہ یہ سبھی بے بنیاد نہیں ہوتیں۔ ان میں سے بعض پریشانیاں واقعی اس نوعیت کی ہوتی ہیں کہ حاجیوں کی شکایات حق بجانب ہی محسوس ہوتی ہیں۔

واقعی دقتیں: مثلاً اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ حج کے دوران خاص خاص تاریخوں کو خاص خاص مقامات پر پہنچنا ہوتا ہے۔ جن میں ''وقوفِ عرفات'' اتنا ضروری ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو سرے سے حج ہی نہیں ہوگا چاہے آپ باقی سب مناسک پورے کر لیں۔ اب اگر آپ

کے معلم صاحب اپنی شاہانہ بے نیازی سے کام لیتے ہوئے آپ کے ان مقامات پر بروقت پہنچنے کا معقول بندوبست ہی نہ کریں تو پھر آخر آپ کیا کریں گے سوائے اس کے کہ پریشانی اور غم کا شکار ہوں اور اگر کچھ زیادہ کمزور دل واقع ہوں تو رونا بھی شروع کر دیں؟ اب بظاہر تو اس مسئلے کا حل یہی ہے کہ معلم حضرات کو اس طرف توجہ دلائی جائے کہ وہ اپنے فرائض کما حقہٗ انجام دیں' لیکن حاجیوں کا کہنا ہے کہ معلم لوگ شکایات سننے کے روادار ہی نہیں ہوتے اور بڑی بے نیازی کا رویہ اختیار کیے رہتے ہیں۔

حاجیوں کو صرف معلم حضرات کی ''بے نیازی'' ہی کے خلاف شکایات نہیں ہوتیں بلکہ اپنے سفارت خانے کے بارے میں بھی اکثر حاجیوں کی رائے اچھی نہیں ہوتی۔ ان کا کہنا ہے کہ دوسرے علاقوں میں سفارت خانے کھولنے کا مقصد ہی یہی ہوتا ہے کہ وہاں اپنے ملک اور اہلِ ملک کے مفادات کا دھیان رکھا جائے۔ مگر پاکستانی سفارت خانوں کے عملے نے شاید یہ سبق پڑھا ہی نہیں ہوتا۔

ایسے ہی وہاں کے قیام کے دوران رہائش کا مسئلہ بھی بہت صبر آزما ہوتا ہے' خصوصاً خواتین کے معاملے میں۔ ایک خاتون نے بتایا کہ وہ اور ان کے میاں ایک ایسے کمرے میں رہتے رہے جہاں چودہ اشخاص اور بھی رہ رہے تھے' جن میں نامحرم لوگ بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورتِ حالات بے پردہ عورتوں کے لیے بھی بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ کجا یہ کہ پردہ نشین اور دیندار عورتوں کا معاملہ ہو۔

ایک عام انسان جب حج کے لیے سفر اختیار کرتا ہے تو عموماً وہ زندگی میں پہلی بار اپنے ملک سے باہر قدم نکال رہا ہوتا ہے۔ جب وہ جدّے کی بندرگاہ یا ہوائی اڈے پر اترتا ہے تو اسے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ اب وہ کیا کرے اور کدھر جائے' اجنبی جگہ مقامی زبان سے ناواقفیت' علاقے کے لوگوں کے مزاج سے عدم آگاہی' ایسی صورت میں جب اس کی

رہنمائی کرنے کے ذمہ دار لوگ اپنے فرائض کے بارے میں لاپروائی کا ثبوت دیتے ہیں تو وہ شدید طور پر پریشان ہو جاتا ہے۔ جدّے میں اترتے ہی ہر حاجی کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ جلد سے جلد مکّہ مکرّمہ پہنچ جائے' مگر ایسے ہونا ایک مہم بن جاتا ہے باوجود اس کے کہ جدّے سے مکّہ مکرّمہ کی مسافت اندازاً سوا گھنٹے' ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ کی نہیں، عام زائرینِ حرم بہت پریشانی سہنے کے بعد ہی حرم تک پہنچ پاتے ہیں۔

ایسے ہی جب لوگ حج کر کے وطن واپس آنے کی تیاری کرتے ہیں تو بعض لوگوں کو جہازوں میں سیٹیں ملنے کے سلسلے میں بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک خاتون نے اپنے سفرِ حج کا حال بتاتے ہوئے کہا کہ جدّے میں ہر حاجی کا ایمان آزمایا جاتا ہے۔ جاتے ہوئے بھی اور آتے ہوئے بھی۔ اور انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جدّے پہنچ کر معلم کے بندوبست کا جو حال نظر آیا' اس کے باعث ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ ان لوگوں کی امداد اور رہنمائی سے بے نیاز ہو کر ذاتی کوشش ہی سے حرم پہنچیں اور عمرہ کریں۔ چنانچہ ہم نے ایسے ہی کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ کام صرف پڑھے لکھے' تجربہ کار لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ ایک عام سیدھا سادا حاجی تو معلم اور اس کے کارندوں کے رحم و کرم پر پڑے رہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ پھر ان خاتون نے یہ بھی بتایا کہ واپسی کے وقت جہاز میں سیٹیں ملنے کے سلسلے میں اتنی دقت ہوئی کہ میں دو ڈھائی دن نقاب ڈال کر ہوائی اڈے کی ایک مسجد میں بیٹھی رہی۔ اس کے بعد ہمیں واپسی کے لیے سیٹیں ملیں۔

یہ چند باتیں مثال کے طور پر بیان کی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بعض پریشانیاں ایسی ہو سکتی ہیں' جنہیں ''واقعی دقتیں'' کہا جا سکے۔ تاہم حج کرنے والوں کو بہت سی پریشانیاں ایسی بھی لاحق ہوتی ہیں جنہیں اگر ''خود پیدا کردہ'' کہا جائے تو غالباً اس میں زیادہ مبالغہ نہ ہوگا۔

خود پیدا کردہ پریشانیاں: مثلاً کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں وہاں کے قیام کے دوران مالی تنگی سے دوچار ہو جانا پڑتا ہے اور اس سے پھر پردیس میں بہت تکلیف ہوتی ہے۔ اب ایسی صورت میں انسان قرض بھی لے تو کہاں سے۔ دوسرے ممالک کے لوگ نہ ہماری زبان سمجھیں نہ ہماری کوئی مدد کر سکیں اور اپنے ملک کے لوگ' اگر اصول وقواعد پر عمل کرنے والے ہیں تو وہ بھی تو وطن سے اتنی ہی رقم لے کر آئے ہوں گے جتنی ہم۔ ان کے پاس بھی قرض دینے کے لیے فالتو رقم کہاں ہوگی۔ اور جنہوں نے فالتو رقم کا کوئی بندوبست کیا بھی ہوگا انہیں ضرور اپنی کچھ اشیاء خریدنی ہوں گی۔ آخر انہوں نے فالتو رقم کا بندوبست اس لیے تو نہیں کیا ہوگا کہ ہمیں قرض بہم پہنچائیں۔

پھر یہ قرض کا چکر باہمی تعلقات کو خراب کرنے کا باعث بھی بن جاتا ہے۔ اگر ہمارے مطالبہ کرنے پر کسی ہم وطن نے ہمیں قرض نہ دیا' تو ہمارا دل اس کی طرف سے خراب ہوگا اور اگر کسی نے لحاظ کے مارے' بادل نخواستہ ہمیں قرض دے ہی دیا اور پھر اسے خود تنگی آ گئی یا وہ اپنی کوئی پسندیدہ شے نہ خرید سکا تو اس کا دل ہماری طرف سے خراب ہوگا۔ غرضکہ مالی تنگی وہاں بہت پریشانی اور الجھنوں کا باعث بن جاتی ہے۔

ایک اور جان لیوا تکلیف جو وہاں پیش آتی ہے' وہ قافلے کے لوگوں کے باہمی تعلقات کی خرابی ہے۔ بسا اوقات ایسے ہوتا ہے کہ جو لوگ مل جل کر ایک گروہ بن کر وہاں جاتے ہیں انہیں باہم ایک دوسرے کے خلاف شکایات پیدا ہو جاتی ہیں اور یہ معاملہ صرف غیروں ہی کے ساتھ پیش نہیں آتا بلکہ قریبی رشتے دار بھی ایک دوسرے کے شاکی ہو جاتے ہیں۔ جن رشتوں میں عموماً عام حالات میں بھی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہی رہتی ہیں' ان کا تو ذکر ہی کیا؟ حقیقی بہن بھائیوں کے درمیان' والدین اور اولاد کے درمیان اور میاں بیوی کے درمیان بھی بعض اوقات شدید قسم کی شکر رنجیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ شے وہاں کے قیام

کے مختصر اور قیمتی لمحات کو بہت تلخ کر دیتی ہے اور یکسوئی سے خدا کی عبادت کی طرف بھی متوجہ نہیں ہونے دیتی۔

ایسے لوگ بھی دیکھے گئے ہیں کہ حج کرنے سے پہلے ان کے باہمی تعلقات نہایت خوشگوار تھے اور تعلقات کی اس خوشگواری ہی کی بناء پر اکٹھے حج کرنے کا پروگرام بھی بنایا گیا تھا' مگر واپسی تک ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے اتنی کدورت پیدا ہو چکی تھی کہ پھر مدتوں وہ صاف نہ ہو سکی۔ بظاہر یہ امر سخت تعجب انگیز ہے کہ آپ ایک مقدس جگہ صرف اس لیے جائیں کہ آپ کا فرض ادا ہو اور آپ کا نامۂ اعمال صاف ہو' مگر وہاں پہنچ کر آپ کی قلبی کیفیت ایسی ہو جائے کہ وہ نامۂ اعمال جو صاف ہو چکا تھا' پھر خراب ہو جانے کے خطرے میں مبتلا ہو جائے۔ یہاں یہ بحث کرنا مطلوب نہیں کہ باہمی تعلقات کی خرابی میں کس کا ہاتھ زیادہ اور کس کا کم ہوتا ہے' اصل شے یہ واضح کرنا ہے کہ یہ باہمی شکر رنجیاں سبھی کے حج کو خراب کرتی اور اس روحانی مسرت میں زہر گھولتی ہیں جس نے زندگی بھر کے لیے ایک شیریں یاد بننا ہوتا ہے۔

یوں تو باہمی شکر رنجیوں کی وجوہ بے شمار ہوتی ہیں' جن کی تفصیل بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں مگر ایک بات جو نوٹ کی گئی ہے اور دوسرے لوگوں سے بھی سنی ہے' یہ ہے کہ بعض لوگ وہاں جا کر عبادت کے معاملے میں ''خود غرض'' سے ہو جاتے ہیں---- وہ اس طرح کہ تقریباً ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت مسجد حرام یا مسجد نبویؐ میں گزارے اور کھانا پکانا' کپڑے دھونا' برتن صاف کرنا وغیرہ کام جو وہاں جا کر بھی کسی حد تک تو کرنے ہی پڑتے ہیں۔ اسے نہ کرنے پڑیں۔ اب یہ کام کسی نہ کسی نے تو کرنے ہی ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب ہر ایک کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ وہ ان کاموں سے جان بچا لے تو پھر عموماً یہ کام قافلے کے اس ایک یا چند لوگوں پر آ پڑتے ہیں' جو طبعاً کمزور اور

''جھک جانے والے'' واقع ہوئے ہوتے ہیں یا جنہیں پہلے ہی زیادہ کام کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ پھر جب یہ کمزور لوگ' ارادی یا غیر ارادی طور پر' ان کاموں کا ذمہ اٹھا لیتے ہیں تو پھر دوسرے لوگ اور بھی زیادہ غیر ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہوئے بالکل ہی لاپرواہو جاتے ہیں اور غیر شعوری طور پر اپنا یہ حق سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ اپنا وقت اپنی مرضی کے کاموں میں صرف کرتے رہیں اور وقت پر انہیں کھانا وغیرہ سب تیار ملے۔

ظاہر ہے کہ یہ صورت حالات ان ''کمزور'' لوگوں کے دلوں میں جلن اور شکایات پیدا کر کے رہتی ہے۔ وہ بھی تو آخر یہاں عبادت کرنے ہی آئے تھے۔ چولہا جھونکنے تو نہیں آئے تھے۔ انہیں گلہ پیدا ہو جاتا ہے کہ ساتھی ان کے صرف پر عبادت کر رہے ہیں اور ان پر بے انصافی کی حد تک بوجھ ڈالا جا رہا ہے۔ دل کے یہ گلے آخر زبانوں پر بھی آ کر ہی رہتے ہیں اور پھر بوجھ ڈالنے والے ساتھی اپنا قصور ماننے اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کرنے کے بجائے مشتعل ہو کر ناراض ہونا شروع کر دیتے ہیں اور یوں باہمی تعلقات میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔

جہاں تک خواتین کی پریشانیوں کا تعلق ہے ان کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بعض عورتیں خدا اور خدا کے رسولؐ کے احکام کو نظر انداز کرتے ہوئے بغیر محرم کے چل پڑتی ہیں اور پھر گوناگوں دقتوں کا شکار ہوتی ہیں۔ اب یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ جس عورت کے ساتھ باپ' بھائی' خاوند' بیٹا کوئی محرم مرد موجود ہوتا ہے اسے کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوتی۔ تاہم یہ تو ضرور ہے کہ اگر کوئی محرم ساتھ ہو گا تو وہ حتی الامکان اسے پریشانی سے بچانے کی کوشش تو کرے گا' برعکس ایک ایسی عورت کے جو غیروں کے ساتھ چل پڑتی ہے۔ پھر ان کے لیے بھی بوجھ بنتی ہے اور خود بھی پریشانیوں میں وقت کاٹتی ہے۔

حل: اب سوال یہ ہے کہ ان مشکلات کا حل کیا ہے۔ انسان کیا کرے کہ اس کے اس

مقدس سفر میں وہ مشکلات نہ آئیں جو اس کی عبادت و ریاضت اور حج کے ذریعے دینی، اخلاقی اور روحانی اصلاح کرنے کے کام میں حارج ہوتی ہیں۔

کچھ ذاتی تجربے اور کچھ حج کرنے والے واقف کاروں اور رشتے داروں کی باتیں سن سن کر چند تجاویز ذہن میں آتی ہیں جنہیں اس امید پر حوالہ قرطاس کیا جا رہا ہے کہ شاید اس مقدس سفر کے مسافروں کو کچھ فائدہ پہنچا سکیں۔

پہلی ضروری بات یہ ہے کہ حج کو جانے سے پہلے جہاں زادِ سفر تیار کیا جاتا ہے، حج کے موضوع پر لکھی ہوئی کتابیں پڑھی جاتی ہیں اور تجربہ کار حاجیوں سے مشورے کیے جاتے ہیں وہاں ایک کام اور کر لیا جایا کرے اور وہ یہ کہ ذہن کو اس سفر کے لیے حتی الامکان اس طرح تیار کر لیا جائے کہ انسان ان دقتوں کو جو ہمارے اختیار سے باہر ہوتی ہیں، بہتر طور پر برداشت کر سکے اور ان مشکلات سے جو بہت حد تک "خود پیدا کردہ" ہوتی ہیں۔ امکان کی حد تک بچ جائے۔ ذہن کو تیار کرنے سے مراد یہ ہے کہ مندرجہ ذیل باتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔

۱۔ اس بات کو اچھی طرح ذہن میں بٹھا لیجئے کہ آپ "سفر" پر جا رہے ہیں اور سفر کتنا ہی آرام دہ کیوں نہ ہو آخر "سفر" ہوتا ہے۔ وہاں آپ کو گھر جیسا آرام کبھی نہیں مل سکتا، نہ آپ کو اس کی توقع رکھنی چاہیے۔ سفر میں بے آرامی ضرور ہوگی۔ آپ ابھی سے اس کے لیے تیار رہیں۔

۲۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ:

"مومن کو جو کوئی تکلیف یا غم یا درد پہنچتا ہے، یہاں تک کہ (معمولی) فکر بھی جو اسے لاحق ہوتا ہے اس کے عوض (بھی) اللہ اس کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔" (ترمذی)

لہٰذا اس راستے میں جو تکلیف بھی آئے گی، چھوٹی ہو یا بڑی، وہ آپ کے گناہوں

کے بخشے جانے کا ذریعہ بنے گی۔ آپ کا دل مطمئن رہنا چاہیے کہ اس راہ کی کوئی پریشانی بھی لاحاصل نہیں ہوگی۔

۳۔ اچھی طرح یاد کر لیجئے کہ اس سفر سے آپ کا مقصد ''حج کرنا'' ہے۔ سیر و تفریح کرنا اور مادی ساز و سامان خریدنا نہیں۔ کہیں ایسے نہ ہو کہ آپ کی توجہ اور وقت کا بیشتر حصہ وہ شے لے لے جو آپ کا اصل مقصد نہیں تھا۔

۴۔ ذہن نشین کر لیجئے کہ شیطان ویسے بھی ہر وقت ہمارے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر اس سفر میں تو وہ بڑے اہتمام سے ساتھ چلتا ہے' وہ آپ کو راہِ راست سے ہٹانے کی کوشش کرتا رہے گا اور اس کی کوشش کی دو خاص شکلیں یہ ہوں گی کہ وہ اس راہ پر چلنے والوں کے باہمی تعلقات خراب کرنے کی سعی کرے گا اور راہ کی دقتوں کو مبالغہ آمیز رنگ میں ان کے سامنے پیش کرے گا۔

۵۔ آخری بات یہ ہے کہ بلاشبہ آپ ایک مشکل سفر پر جا رہے ہیں' اللہ سے آسانی کی دعا مانگتے رہیے گا اور اس درخواست کو کبھی نہیں بھولیے گا کہ

رَبِّ یَسِّرْ وَلَا تُعَسِّرْ

(اے میرے رب' آسان کر اور مشکل نہ کر)

اگر آپ نے اپنے سفر سے پہلے اپنے ذہن میں ان باتوں کو اچھی طرح بٹھا لیا تو انشاء اللہ آپ کی راہیں خدا کی مہربانی سے' بہت آسان ہو جائیں گی۔ آپ ''خود پیدا کردہ'' تکالیف کے بہت بڑے حصے سے بچ جائیں گے اور جو تکالیف آئیں گی بھی' ان کا احساس کم ہوگا۔

اب عین ممکن ہے کہ بعض تجربہ کار ''حاجی یہاں پکار اٹھیں کہ یہ بات ناتجربہ کاری کی بناء پر کہی جا رہی ہے اور ایسی بات صرف وہی کر سکتا ہے جس نے یا تو یہ سفر کیا ہو نہ ہو یا

کسی وجہ سے یہ دقتیں اس کی راہ میں آئی نہ ہوں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ناتجربہ کاری کی بناء پر نہیں کی جارہی بلکہ تجربے ہی نے بتایا ہے کہ زائرین حرم کی بہت سی پریشانیاں ایک حد تک ''خود پیدا کردہ'' ہوتی ہیں۔ مثلاً ان پریشانیوں کو لیجئے جو حاجیوں کو مالی تنگی کے باعث پیش آتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں بعض لوگ ایسے بھی ہوں جن کی یہ پریشانی کسی حادثے کا نتیجہ ہو ورنہ ایک عام حاجی کو ملکی حکومت اتنے پیسے تو ضرور لے جانے دیتی ہے جس سے اس کا گزارا چل جائے۔ اب یہ کیوں ضروری ہے کہ وہ وہاں بے فائدہ خریداری بھی کرے اور اس طرح اپنی رقم کو کم کرلے۔

یہاں اس بات کو یاد کر لیجئے جو آپ نے سفر حج سے پہلے ذہن نشین کی تھی کہ آپ یہاں ''حج'' کے لیے آئے ہیں' گھر کا ساز وسامان اور تحائف خریدنے نہیں آئے۔ بے شک تحائف دینا سنت ہے لیکن ان کا سعودی عرب ہی سے خریدا جانا سنت نہیں ہے۔ وہ کون سی شے ہے جو آپ کے اپنے ملک میں نہیں ملتی۔ کچھ پیسے ہی تو زیادہ دینے پڑیں گے' تو ان تھوڑے سے پیسوں کو بچانے کے لیے آپ اس حسین عمل کے حسن کو خراب کرنے کے کیوں درپے ہیں جو شاید آپ نے زندگی میں ایک ہی دفعہ کرنا ہے۔ پیسے کی کمی کے باوجود بعض لوگ خریداری کے لیے اتنے بے قرار رہتے ہیں گویا وہ حج کرنے نہیں آئے صرف اشیاء خریدنے آئے ہیں یا کم از کم یہاں آنے سے ان کا ایک بڑا مقصد خریداری کرنا بھی تھا۔

اب یہ تو ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ جو لوگ وہاں خریداری کرتے ہیں وہ کوئی ناجائز کام کرتے ہیں' کیونکہ قرآن کی رو سے تو حاجی کو تجارت وغیرہ کرنے یعنی روزی کمانے کی بھی اجازت ہے تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ جو حاجی خرید وفروخت کرتے ہیں' وہ کوئی غلط کام کرتے ہیں مگر صورت یہ ہے کہ ایک تو یہ بالکل جائز کام مالی تنگی کا ذریعہ بن کر

پریشانیاں بہم پہنچاتا ہے جس کے باعث وہاں کے قیام کے دوران کی عبادت خشوع و خضوع اور اطمینانِ قلب سے ادا نہیں ہونے پاتی اور دوسرے یہ "جائز" کام ایک "ناجائز کام" بلکہ شاید "کئی ناجائز کاموں" کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

وہ اس طرح کہ جو لوگ ایسی اشیاء خرید لیتے ہیں جن پر ہمارے ملک میں محصول لگتا ہوتا ہے' ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح وہ محصول سے بچ جائیں کیونکہ محصول دینے کی صورت میں وہ چیز اتنی مہنگی پڑتی ہے کہ اسے باہر سے لانے کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا اور اگر محصول نہ دیا جائے تو گناہ کا خطرہ ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہوا ہے:

اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ (اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں (یعنی حکومت کی)۔

اور یہ "صاحب امر" لوگوں کا حکم ہے کہ معین اشیاء پر محصول دیا جائے۔ چنانچہ محصول بچا کر اس نافرمانی کا ارتکاب کیا جاتا ہے جس سے قرآن روکتا ہے۔ پھر اس صورتِ حالات کا ایک اور سیاہ پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اشیاء کو محصول سے بچانے کے لیے جھوٹ بولنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ گویا پہلے گناہ بخشوا کر مزید گناہ اکٹھے کرنے کا آغاز بھی کر دیا جاتا ہے۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ آخر پیسے دے کر چیز خریدی جاتی ہے' اس میں اعتراض کی بات کیا ہوئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض کام تو فی نفسہٖ ناجائز ہوتے ہیں۔ مثلاً شراب پینا' اور بعض فی نفسہٖ ناجائز نہیں ہوتے مگر خاص قسم کی صورت حالات میں ناجائز ہو جاتے ہیں۔ مثلاً روزہ رکھ کر کھانا پینا۔ لہٰذا باہر سے چیز خرید کر ملک کے اندر لے آنا فی نفسہٖ تو بالکل

درست بات ہے مگر جب اسے محصول سے بچا کر لایا جاتا ہے تو یہ فعل ناجائز ہو جاتا ہے۔ آخر جسے ہم سمگلر کہتے ہیں وہ یہی کام تو کرتا ہے کہ اشیاء کو ناجائز طور پر ملک کے اندر لاتا اور ملک سے باہر لے جاتا ہے۔ اشیاء تو اس نے بھی پیسے دے کر ہی خریدی ہوتی ہیں۔

ایک واقعہ یہاں بیان کیا جاتا ہے جس سے کچھ اندازہ ہو جائے گا کہ خریداری کی دھت کس طرح عبادت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ایک خاتون بیان کرتی ہیں کہ ناتجربہ کاری کی بناء پر ہم عین جمعے کے دن بازار جا نکلے۔ مدینہ منورہ میں یہ پہلا جمعہ تھا اور اندازہ ہی نہیں تھا کہ جمعے کے دن مسجد نبویؐ میں جگہ حاصل کرنے کے لیے کتنی جلدی وہاں جانا ہوتا ہے۔ دکانوں کے چکر لگا کر اپنے خیال میں بروقت واپس آ گئے مگر اب یہ صورت تھی کہ گھر تک پہنچنا ناممکن ہو چکا تھا۔ جمعے کے لیے کپڑے بدلنے اور وضو وغیرہ کرنا تھا' مگر جس طرف بھی رخ کرتے راستہ بند نظر آتا۔ سڑکیوں گلیوں میں نمازیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ بیٹھے تھے اور اتنی جگہ بھی نہیں ملتی تھی کہ سکڑ سکڑا کر ہی وہاں سے گزر جائیں۔ سخت پریشانی ہوئی اور اپنے آپ کو بہت کوسا کہ آج ہی بازار جانا تھا کیا۔ ایک طرف رخ کرتے ہیں تو انڈونیشیا والوں کے پرے کے پرے نماز کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ دوسری طرف کی راہ اختیار کرتے ہیں تو کسی اور مسلمان ملک کی فوج راستہ روکے بیٹھی ہے۔

کچھ دیر ادھر ادھر پھرنے کے بعد آخر گھر جانے کا خیال دل سے نکال دیا اور یہ تلاش شروع ہوئی کہ کہیں سے پانی مل جائے تو وضو ہی کر لیں۔ نماز کا وقت قریب آ رہا تھا اور ہم سخت گھبراہٹ کے عالم میں تھے۔ ایک شخص کی منت کی تو اس نے تھوڑا سا پانی دیا۔ وہیں سڑک پر ایک طرف ہو کر وضو کیا۔ مسجد کے ایک دروازے کے پاس عورتوں کا مجمع تھا۔ میں تو دوڑ کر ان میں گھس گئی اور ساتھ والے پتہ نہیں کہاں چلے گئے۔ یہاں کھڑے ہونے کی جگہ تو مل گئی مگر سجدہ کرنے کے لیے ایک انچ زمین بھی نہ مل سکی۔ مجھ سے آگے والی عورت

جب سجدہ کرتی تو میں اس کی پشت پر سجدہ کر لیتی۔

نماز پڑھ کر گھر پہنچے تو دل ندامت سے چور چور تھا۔ یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جس نماز میں زمین پر سجدہ ہی نہیں ہوا' وہ نماز ادا بھی ہوئی ہے یا نہیں۔ اس لیے گھر آ کر دوبارہ نماز ادا کی اور کانوں کو ہاتھ لگائے کہ آئندہ سے دیکھ بھال کر گھر سے نکلنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی کہ بعض وجوہ کے باعث مدینہ منورہ میں ہمارا قیام ایک ہفتہ اور بڑھ گیا۔ اگلے جمعے ہم دن کے شروع ہی میں مسجد نبویؐ میں جا بیٹھے اور الحمدللہ کہ مسجد کے اندر بہت اچھی جگہ نماز ادا کی۔ کبھی سوچتی ہوں کہ اگر مدینہ منورہ میں ہمارے قیام کے دن بڑھ نہ جاتے تو ہماری خریداری کی حرص نے تو ہمیں وہاں جمعہ پڑھنے کی سعادت سے گویا ہمیشہ کے لیے محروم ہی کر دیا تھا۔ ہمیشہ کے لیے اس لیے کہہ رہی ہوں کہ آج اس واقعے کو کم و بیش انتیس سال ہو گئے ہیں مگر پھر وہاں حاضر ہونے کی توفیق نصیب نہیں ہوئی۔

جن کے پاس فالتو وقت اور وافر روپیہ ہو اور جنہیں اپنی قابلِ محصول اشیاء کو محصول سے بچانے کی خواہش نہ ہو۔ ان کے لیے خریداری کوئی شجرِ ممنوعہ نہیں۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہاں جا کر ذکر و تسبیح' درود و سلام اور طواف و تلاوت میں جو کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں اور مالی پریشانیاں پیش آتی ہیں ان کا ایک سبب یہ بے کار خریداری بھی ہوتی ہے۔ اب اگر انسان دل کو قابو میں رکھے اور بے کار خریداری نہ کرے تو پریشانیوں کی اس قسم سے تو بچا ہی جا سکتا ہے ---- پھر جن پریشانیوں سے ہم بچ سکتے ہیں مگر بچتے نہیں' انہیں اگر ''خود پیدا کردہ'' کہا جائے تو اس میں ناتجربہ کاری کی بات کون سی ہے۔

پھر اس شے کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ حج جو کبھی مسلمان اقوام کی صنعتوں کے فروغ کا ایک ذریعہ ہوتا تھا۔ اب غیر مسلم اقوام بلکہ دشمنِ اسلام اقوام کی صنعتوں کے

فروغ کا ذریعہ بن گیا ہے۔ کیونکہ جو اشیاء وہاں خریدی جاتی ہیں وہ اکثر و بیشتر ان ممالک کی مصنوعات ہوتی ہیں جن کی اسلام دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔

اب ان پریشانیوں کو لیجئے جو باہمی تعلقات خراب ہو جانے کے باعث پیدا ہوتی ہیں' انہیں ''خود پیدا کردہ'' کی فہرست میں اس لیے رکھا گیا ہے کہ اگر انصاف سے غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی بہت حد تک خود پیدا کردہ ہی ہوتی ہیں۔

وہ شیطان جو گھر سے آپ کے ساتھ آیا تھا' اسے آپ اتنا احمق نہ سمجھیں کہ یہاں آ کر وہ آپ کو فسق و فجور کا حکم دے گا اور آپ کو اس امر پر بہکائے گا کہ آپ نعوذ باللہ حرم کے سائے میں بیٹھ کر برے کام کریں۔ اسے معلوم ہی ہے کہ جو لوگ دور دراز کے سفر کی کوفت اٹھا کر یہاں پہنچے ہیں ان میں غالب اکثریت انہیں کی ہے جنہیں خدا کا خوف' خدا کی محبت اور فرض کا احساس ہی یہاں لایا ہے۔ اس لیے شیطان کے لیے بھی آسان نہیں کہ وہ انہیں فسق و فجور کی طرف مائل کر سکے۔ تاہم اس نے آپ کو بہکانے کی کوشش تو کرنی ہی ہے۔ آخر پھر وہ اس کے سوا اور کیا کرے کہ آپ سے ایسے کام کروائے جو ہوں تو مضر اور ناپسندیدہ ہی مگر خود آپ کو بھی پتہ نہ چل سکے کہ آپ کوئی ناپسندیدہ کام کر رہے ہیں۔

شیطان نہیں چاہتا کہ آپ یاد الٰہی سے دل کو آباد کریں یا اپنی دینی اور اخلاقی اصلاح میں مصروف ہوں یا وہ مخصوص روحانی سکون اور مسرت حاصل کریں جو ان متبرک مقامات ہی میں حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لیے وہ دوسرے حیلوں کے علاوہ اس حیلے پر بھی خصوصی زور دیتا ہے کہ آپ کے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے کدورت پیدا کر کے آپ کے غم و الم کا تماشا دیکھے۔ اس سے اس کے دو مقاصد حاصل ہوتے ہیں۔ ایک تو آپ بے چین اور دکھی ہوتے ہیں اور وہ بحیثیت ایک دشمن کے آپ کو بے چین اور دکھی ہی دیکھنا چاہتا ہے اور دوسرے آپ اپنے قیمتی لمحات کو بہتر کاموں پر صرف کرنے کے بجائے

بیکار جلنے کڑھنے اور شکوے شکایتیں کرنے پر صرف کر دیتے ہیں اور اس سے بھی اسے خوشی حاصل ہوتی ہے۔

لوگوں کے باہمی تعلقات خراب کرانے کے معاملے میں تو شیطان جیسے اس سفر میں خاص طور پر ہوشیار رہتا ہے۔ بڑا تعجب انگیز امر یہ ہے کہ جن لوگوں کے تعلقات عام حالات میں خوشگوار ہوتے ہیں۔ ان میں سے بھی بعض حج کے دوران ایک دوسرے سے شاکی رہنے لگتے ہیں۔ اب یہ تو طے شدہ بات ہے کہ جب دو انسانوں کے باہمی تعلقات بگڑتے ہیں تو کچھ نہ کچھ قصور دونوں ہی کا ہوتا ہے مگر کوئی بھی یہ ماننے کو تیار نہیں ہوتا کہ زیادتی اس کی ہے۔ اب اگر وہاں انسان اس بات کا فیصلہ کرنے بیٹھ جائے کہ زیادتی کس کی ہے تو ظن غالب ہے کہ فیصلہ ہونے سے پہلے وہاں کے قیام کی مدت ختم ہو جائے گی۔ لہٰذا جس شخص کو یاد ہو کہ وہ یہاں حج کرنے آیا ہے اپنے آپ کو مظلوم ثابت کرنے نہیں آیا۔ اس کے لیے محتاط طریقہ یہی ہے کہ وہ عفو و درگذر سے کام لے اور یاد رکھے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کے پیچھے صرف شیطان کا ہاتھ ہے اور وہ یہاں شیطان کو ہرانے آیا ہے اسے کامیاب بنانے نہیں آیا۔

یاد رکھیے کہ شیطان تو وہ ڈھیٹ ہستی ہے جس نے خلیل اللہؑ کو پھسلانے کی کوشش کرنے کی جسارت بھی کر لی تھی۔ ہم آپ بھلا کس شمار و قطار میں ہیں۔ اب آپ اگر یہاں اس لیے آئے ہیں کہ سنت ابراہیمیؑ کو پورا کریں تو ضروری ہے کہ ابراہیمؑ کی پیروی بھی کریں۔ ابراہیمؑ نے تو شیطان کو کنکر مار کر بھگا دیا تھا اور ہم ان کی پیروی میں کنکر تو مار لیتے ہیں مگر شیطان کو بھگاتے نہیں بلکہ بڑی فراخدلی سے اسے اجازت دیتے ہیں کہ وہ ہمیں باہم لڑا کر اپنی فتح کی خوشی منائے۔

مختصر یہ کہ جو بے چینیاں باہمی تعلقات کی خرابی کے باعث پیدا ہوتی ہیں ان کا

حل یہی ہے کہ جیسے ہی کسی کی طرف سے دل میں میل آئے فوراً سمجھ جایئے کہ شیطان وار کر رہا ہے اور اَعُوذ پڑھ کر خدا کی طرف دھیان دیجئے اور باہمی اتفاق کی دعا کیجئے۔ یاد رکھیے کہ عاجزی اور انکساری حاجی کا زیور ہے اور عفو و درگذر سے کام لینا ویسے تو ہمیشہ ہی بڑی فضیلت کی بات ہوتی ہے تاہم حج کے دوران تو اس کی خصوصی ضرورت رہتی ہے۔ اگر دو انسان آپس میں الجھ پڑیں تو ان میں خلوص سے اللہ کی راہ پر چلنے والا وہ ہے جو عفو و درگزر سے کام لے کر شیطان کی کوششوں کو ناکام کرے اور قافلے کے اتفاق کے قائم رہنے کا بندوبست کرے۔ باہمی تعلقات درست رہیں گے تو ہر ایک کے دل کو سکون رہے گا اور اگر بگڑ گئے تو پھر ظالم اور مظلوم' زیادتی کرنے والا اور زیادتی سہنے والا' سبھی بے چین رہیں گے اور یہ بے چینی ان کی توجہ کو اصلی کام سے ہٹا دینے کا باعث بن جائے گی۔ کیا یہ مناسب نہیں کہ جس عبادت کے لیے آپ اتنی دور دراز کی مسافت کاٹ کر آئے ہیں' اسے بہتر طور پر ادا کرنے کے لیے آپ کچھ دن کے لیے اس بات سے بے نیاز ہو جائیں کہ آپ سے حسنِ سلوک ہو رہا ہے یا بدسلوکی۔ کیونکہ یہ تھوڑا سا وقت اپنی انا کو پالنے اور اپنے نفس کی عزت افزائی میں لگے رہنے کے لیے نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ ذکر و تسبیح' دعا و استغفار' درود و سلام اور طواف و تلاوت کرنے' رضائے الٰہی حاصل کرنے اور اجر و ثواب سمیٹنے کے لیے ہے۔

حضرت ابو امامہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو شخص حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دے میں اس کے لیے ایک گھر کا ضامن ہوں جو بہشت کے نواح میں ہوگا۔" (ابوداؤد)

جہاں کاموں کے باعث لوگ ایک دوسرے سے الجھ پڑتے ہیں۔ وہاں بھی دلوں میں شکایتیں پالنے اور آخر کار الجھ پڑنے کے بجائے ساتھ والوں کو آرام سے سمجھانے

کی ضرورت ہے کہ آخر سبھی لوگ عبادت کرنے ہی آئے ہیں' اس لیے کاموں کو ایک یا چند ایک پر ڈال دینے کے بجائے مل بانٹ کر کرنا مناسب ہے۔ جنہیں بہت کام کرنا پڑتا ہے' وہ آخر تو بول ہی اٹھتے ہیں تو بجائے اس کے کہ آخر بولیں اور غصے سے بولیں۔ شروع ہی میں آرام سے بات کر کے کاموں کو بانٹ لینے کا مشورہ کیوں نہ دیں۔

اب جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جو اپنے حصے کا کام بھی دوسروں کے کندھوں پر ڈال کر خود زیادہ عبادت کر لیتے ہیں' تو انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ عبادت کا اصل مقصود تو رضائے الٰہی اور اجر ہے جو خدا تعالیٰ نے دینا ہے اور خدا تعالیٰ کو تو بے انصافی سخت ناپسند ہے۔ آپ کو کیسے معلوم ہے کہ دوسروں کے کندھوں پر نامناسب بوجھ ڈال کر اور ان کے دلوں کو رنجیدہ کر کے آپ جو وقت مسجد حرام اور مسجد نبویؐ میں گزارتے ہیں۔ اس کا آپ کو خدا ضرور ہی اجر دے گا۔ جس عبادت کی بنیاد بے انصافی پر ہو اس کے اجر کے بارے میں زیادہ خوش گمانی میں مبتلا ہونا مناسب نہیں۔

ایسے ہی بعض خواتین کی پریشانیوں کی ایک خاص وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ بغیر محرم کے چل پڑتی ہیں اور پھر سخت تکالیف کا شکار ہوتی ہیں۔ حج کے سلسلے میں جن معلم حضرات اور ان کے کارندوں سے معاملہ پڑتا ہے ان کے لیے حج پیشے کی حیثیت رکھتا ہے جس سے وہ روزی کماتے ہیں۔ لہٰذا حاجیوں کے ساتھ ان کا رویہ ایسا کاروباری قسم کا ہوتا ہے کہ بڑے بڑے ہوشیار مردوں کی عقلیں بھی بعض اوقات چکرا کر رہ جاتی ہیں کجا یہ کہ سیدھی سادی' بھولی عورتیں' جو شاید ہی کبھی اپنے ملک سے باہر نکلی ہوں' ان کے رحم و کرم پر جا پڑیں۔

دو پاکستانی عورتوں کو دیکھا گیا جن کے ساتھ کوئی مرد نہ تھا۔ وہ غالباً کوئی شکایت لے کر معلم کے پاس آئی ہوئی تھیں اور معلم انہیں اس بری طرح جھاڑ رہا تھا اور ایسی سخت زبان استعمال کر رہا تھا کہ دل بری طرح دکھ گیا۔ اب اگر ان عورتوں کے ساتھ کوئی محرم مرد

ہوتا تو ان کی یہ گت تو نہ بنتی۔ معلم صاحب نے اگر اپنی زباندانی کے جوہر دکھانے بھی ہوتے تو اس مرد کے سامنے دکھاتے' ان کے سامنے تو نہ دکھاتے۔

یہ صورتِ حالات اس وقت اور بھی زیادہ افسوس ناک نظر آتی ہے جب کوئی ایسی خاتون بغیر محرم کے حج کو نکل کھڑی ہوتی ہیں جنہوں نے پہلے حج کیا ہوا ہوتا ہے۔ جن عورتوں نے فرض حج نہ کیا ہوا ہو اور محرم ساتھ جانے کو تیار نہ ہوں تو وہ تو شاید کسی فقہی مسئلے کی آڑ لے بھی لیں' مگر جن کا فرض ادا ہو چکا ہو ان کے پاس حضورؐ کے صریح فرمان کی خلاف ورزی کرنے کے لیے کیا جواز ہے۔

حضرت ابن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''عورت تین دن کا سفر نہ کرے جب تک کہ اس کے ساتھ اس کا محرم نہ ہو۔'' (مسلم)

ایسی خواتین جب طرح طرح کی پریشانیوں کا شکار ہوتی ہیں تو پھر آپ ان کی پریشانیوں کو ''خود پیدا کردہ'' نہ کہیں گے تو کیا کہیں گے۔

سفرِ حج کے دوران کی بے چینیوں کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ بعض لوگ وہاں جا کر بھی روزمرہ کے تکلفات کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ بار بار کپڑے بدلے جا رہے ہیں اور پرتکلف کھانے پک رہے ہیں۔ اب یہ کام جتنے بڑھائے جائیں گے' اتنا ان پر وقت زیادہ صرف ہوگا اور یہ وقت آخر عبادت و ذکرِ الٰہی اور مسجد حرام اور مسجد نبویؐ میں رہنے کی سعادت ہی سے کاٹا جائے گا۔ پھر وہاں کون سے نوکر ہوتے ہیں کہ آپ ذکرِ الٰہی کرتے رہیں اور وہ آپ کے سارے کام کر دیں۔ یہ کام زیادہ تر خواتین ہی کو کرنے پڑتے ہیں اور ان کے دلوں میں پھر شکوے پیدا ہوتے ہیں کہ خانہ خدا اور مدینۃ النبیؐ میں آ کر بھی ہنڈیا چولہا اور گھر کے دھندوں سے جان نہ چھوٹی۔

کیا یہ بہتر نہیں کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے قیام کی تھوڑی سی مدت کو سادگی

سے گزارا جائے۔ زبان کے چٹخارے اور تکلفات کے لیے ساری عمر پڑی ہے۔ کھانے میں سادگی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ برتن بھی کم اکٹھے ہوں گے اور زیادہ برتن دھونے پر جو زیادہ وقت صرف ہوتا ہے وہ بھی بچ جائے گا۔ مسجد نبویؐ میں ایک خاتون نے بتایا کہ ہم صبح اٹھ کر بگھار لگا کر نمکین چاول پکا کر رکھ دیتے ہیں' جسے بھوک لگتی ہے' جا کر تھوڑے سے کھا آتا ہے۔

چونکہ حج میں سفر بہت کرنا ہوتا ہے' اس لیے بعض اوقات کھانا نہ پکا سکنے کا مسئلہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اگر کھانے کی خشک اشیاء ساتھ رکھی جائیں تو بہت مفید ثابت ہوتی ہیں اور انسان بہت سے تردّد اور دقتوں سے بچ جاتا ہے۔

غرضکہ حج کے سفر کے دوران پیش آنے والی پریشانیوں میں سے خاصا حصہ ان پریشانیوں کا ہے جن کا حل بہت حد تک ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہے بشرطیکہ ہم عقل و فکر سے کام لیں اور احکامِ شریعت اور اسلام کے نظامِ اخلاق کی پیروی کریں۔

جہاں تک معلم حضرات اور ملکی سفارت خانے کی ''بے نیازی'' رہائش کی دقتوں اور جہاز میں بروقت سیٹیں نہ ملنے کا تعلق ہے' ان کو دور کرنا ایک عام حاجی کے بس کا روگ نہیں' البتہ وہ حج کرنے والے جو وسائل و ذرائع کے مالک ہوتے ہیں اور جن کا اثر و رسوخ انہیں اس قابل بنائے ہوتا ہے کہ ملکی حکومت اور سفارت خانے کے ذمہ دار افراد اور جہازوں کی کمپنیوں سے مؤثر بات کر سکیں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ حاجیوں کی راہ میں آنے والی دقتوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں ملکی صحافت سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔ اخبارات میں مضامین لکھ کر اور خطوط بھیج کر ذمہ دار انسانوں کو اس اہم مسئلے کی طرف متوجہ کیا جا سکتا ہے۔ نجی محفلوں میں بیٹھ کر جزع فزع کرنے اور لوگوں کو حج سے ڈرانے سے تو یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اثر و رسوخ رکھنے والے اور اہل قلم لوگ خود بھی جدوجہد کریں اور ذمہ دار لوگوں کو بھی حالات درست کرنے کی طرف توجہ دلائیں۔

حرم کی طرف سفر کرنے والوں کے شایانِ شان تو یہی ہے کہ وہ اس مقدس سفر کی ہر وقت کو صبر، حوصلے اور وقار سے برداشت کریں۔ مگر ذمہ دار انسانوں کا فرض ہے کہ وہ جس کام کی تنخواہیں لیتے اور سہولتیں حاصل کرتے ہیں اس کام کی طرف کما حقہٗ توجہ دیں۔ سخت افسوس کا مقام ہے کہ پاکستانی سفارت خانوں کے بارے میں لوگوں کو بہت شکایات رہتی ہیں اور جن لوگوں کو ان کی ضرورت پیش آتی ہے، وہ انہیں دوسرے ممالک کے سفارت خانوں کے مقابلے میں فرض ناشناس قرار دیتے ہیں۔ یہ کہنا تو بہت مشکل ہے کہ یہ سبھی شکایات ضرور درست ہی ہیں تاہم یہ شکایات اتنی عام ہیں کہ ماننا پڑتا ہے کہ اتنے زیادہ لوگ غلط بیانی پر جمع نہیں ہو سکتے۔

ایسے ہی جہازوں کی کمپنیوں کو بھی توجہ دلانے کی ضرورت ہے کہ وہ راہ حق کے مسافروں کی سہولت کا خیال رکھیں اور اپنے بندوبست کی ان خامیوں کو دور کریں، جن کے باعث زائرینِ حرم کو سیٹوں کے معاملے میں اتنی دقتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

جہاں تک معلم حضرات کے رویے اور وہاں کی رہائش کی تکلیفوں کا تعلق ہے۔ اگرچہ یہ امور براہ راست ہماری حکومت سے تعلق نہیں رکھتے تاہم حکومت اپنے باشندوں کے مفادات کے سلسلے میں دوسری حکومتوں سے بات تو کر سکتی ہے۔ بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جو توجہ دلانے ہی سے کیے جاتے ہیں۔

بحیثیت مجموعی حج کرنے والوں کو یہی مشورہ دیا جا سکتا ہے کہ وہ ایسا رویہ اختیار کریں جو راہِ حق کے مسافروں کے شایانِ شان ہو۔ دقتیں چھوٹی ہوں یا بڑی، انہیں ہرگز اس بات کی اجازت نہ دیجئے کہ وہ آپ کو ذکر الٰہی اور تزکیہ نفس کی مصروفیت سے ہٹا کر اپنی ''مظلومیت'' کے احساس میں الجھا لیں۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ جب کوئی دقت محسوس ہو تو غور کر لیا جایا کرے کہ آیا یہ دقت واقعی اتنی ہی بڑی ہے جتنی مجھے نظر آ رہی ہے یا کہ شیطان

جنہیں دل شکستہ کرنے کے لیے اس وقت کو مبالغہ آمیز رنگ میں پیش کر رہا ہے۔

ایک بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جن واقعات یا حالات کو ہم مشکلات سمجھتے ہیں انہیں ہر شخص اپنے میلانِ طبع اور اپنی قوتِ برداشت کے لحاظ سے مشکل یا آسان سمجھتا ہے۔ ایک شخص کو کھانے پینے کی طرف زیادہ میلان نہیں۔ اسے اگر کئی وقت کا فاقہ بھی آجائے گا تو یہ اس کے لیے کوئی ناقابلِ برداشت مصیبت نہیں ہوگا۔ حالانکہ اس کے برعکس جو شخص بھوک برداشت نہ کر سکتا ہو' اس کے لیے ایک وقت کا فاقہ بھی بہت بڑی مصیبت ہو گا۔ ایسے ہی جن لوگوں کا دل مال میں اٹکا رہتا ہے انہیں اگر کاروبار میں ذرا سا بھی خسارہ ہو جائے تو وہ سمجھتے ہیں کہ ان پر پہاڑ آ ٹوٹا۔ مگر جو لوگ زر پرست واقع نہیں ہوئے' وہ اس سے بہت زیادہ مالی نقصان کو آرام سے برداشت کر لیتے ہیں اور اسے کوئی بہت بڑی مصیبت نہیں سمجھتے۔

لہٰذا اصل شے مشکلات نہیں بلکہ مشکلات کا احساس ہے۔ جو انسان یہ سمجھ لے کہ دکھ تکلیف نے مجھے نفع ہی دینا ہے اسے تکلیف کم محسوس ہوگی۔

اور جہاں تک دعا کا تعلق ہے' یہ تو مومن کا ہتھیار ہے۔ سفر ہو یا حضر' جو مومن اس ہتھیار سے غفلت برتے گا' وہ جلد ہی محسوس کر لے گا کہ شیطان کے لشکر چاروں طرف سے یلغار کرتے چلے آ رہے ہیں اور وہ تنِ تنہا' بے سامان' بے سہارا کھڑا ہے۔ جن خاتون نے بتایا کہ انہیں اور ان کے میاں کو ایک ایسے کمرے میں رہنا پڑا جہاں چودہ اور اجنبی لوگ بھی رہ رہے تھے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جب تکلیف زیادہ ہو گئی تو میں نے تضرع وزاری سے خدا سے دعا کی۔ اللہ ہی کی طرف سے ایک ہمدرد ایسے مل گئے جنہوں نے ہمیں ایک علیحدہ کمرہ دے دیا اور ہم اس سب تکلیف سے بچ گئے جو نامحرموں کے ساتھ رہنے کے باعث پیش آ رہی تھی۔

اللہ رب العلمین کا فرمان ہے کہ زادِ راہ ساتھ لے لو اور بہترین زاد پرہیز گاری ہے۔ واضح رہے کہ یہ پرہیز گاری ہی کا حصہ ہے کہ

۱۔ تنگی تکلیف آنے پر آپ جزع فزع کرنے، شکووں شکایتوں میں مصروف ہونے اور بے صبری سے کام لینے سے پرہیز کریں۔

۲۔ اپنے ہمسفر بہن بھائیوں سے الجھنے سے پرہیز کریں اور اگر کوئی آپ سے الجھ پڑے تو مشتعل ہو کر حالات کو زیادہ خراب کرنے سے پرہیز کریں۔

۳۔ ہر لایعنی کام اور ہر لایعنی کلام جو حج کے حسن کو خراب کرنے والا ہو اس میں مصروف ہونے سے پرہیز کریں۔

۴۔ جس رؤوف و رحیم مالک نے آپ پر اتنا کرم فرمایا ہے کہ آپ کو اپنے پاک گھر اور اپنے نبیؐ کی پاک مسجد کا دیدار کرا دیا ہے، جزع فزع کر کے اس کی ناشکری کرنے سے پرہیز کریں۔

۵۔ اور ہر غیر ضروری مصروفیت میں اپنے آپ کو الجھا کر مناسکِ حج، ذکرِ الٰہی، طواف و تلاوت اور درود و سلام میں کوتاہی کرنے سے پرہیز کریں۔

یاد رکھیے کہ یہ حج کا سفر آپ کی زندگی کی وہ بہار ہے جو شاید پھر کبھی لوٹ کر نہ آئے۔ جتنے پھول چنے جا سکتے ہوں چن کر اپنا دامن بھر لیجئے، باقی کاموں کے لیے تو ساری زندگی پڑی ہے۔

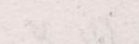

حج کی اجتماعی برکات

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک معاشرتی حیوان بنایا ہے جو ایک دوسرے سے مل جل کر ہی زندگی گزار سکتا ہے۔ کھانے کا ایک لقمہ منہ میں ڈالنے کے لیے بھی اسے بے شمار دوسرے انسانوں کی محنت و مشقت کا احسان مند ہونا پڑتا ہے۔ ایسے ہی اگر وہ اپنے جسم کو انتہائی معمولی کپڑوں سے بھی ڈھانپنے یا سر چھپانے کے لیے ایک جھونپڑی ہی تعمیر کر لے تو اس کے لیے بھی اسے جن اشیاء کی ضرورت پیش آتی ہے انہیں تیار کرنے میں بے شمار لوگوں نے اپنے اپنے حصے کی محنت صرف کی ہوتی ہے۔

چونکہ انسان کو اپنے ہر چھوٹے بڑے کام کی تکمیل کے لیے دوسرے انسانوں کے تعاون کی لازماً ضرورت ہوتی ہے' اس لیے انسان کے لیے مفید طرزِ زندگی وہی ہو سکتا ہے جو اس کے دوسرے انسانوں سے ملتے جلتے رہنے کو ضروری قرار دے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ترکِ دنیا کو پسند نہیں کیا گیا اور یہی سبب ہے کہ عفو و درگزر سے کام لینے اور دوسروں کی زیادتی کو نظر انداز کر کے ان سے ملتے جلتے رہنے کو بہت فضیلت کی بات قرار دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جو نظامِ زندگی عطا کیا ہے اس میں اس بات کا خاص اہتمام ہے کہ انسانی گروہ تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد کہیں اکٹھے ہوتے رہیں۔ نماز بظاہر صرف فرد اور اس کے خالق کا باہمی معاملہ ہے مگر اس کے ساتھ جماعت کی پابندی لگا کر یہ بندوبست فرما دیا گیا ہے کہ ایک محلے کے لوگ دن میں پانچ مرتبہ محلے کی مسجد میں

جمع ہو جایا کریں۔

پھر ہر عاقل، بالغ، آزاد مسلمان مرد کے لیے ضروری ہے کہ جمعے کی نماز میں شریک ہو۔ اس طرح روزمرہ نماز پنجگانہ کے لیے جمع ہونے والے لوگوں سے بہت زیادہ تعداد کے لوگ ہفتے میں ایک دفعہ جامع مسجد میں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

پھر عید الفطر اور عید الاضحیٰ کو خوشی کے مواقع قرار دے کر ساتھ اجتماعی نمازِ عید کی پابندی بھی لگا دی گئی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کم و بیش پوری بستی سال میں دو دفعہ عیدگاہ میں اکٹھی ہو جاتی ہے۔

پھر صاحبِ استطاعت لوگوں پر حج فرض کر کے یہ بندوبست فرما دیا گیا ہے کہ تمام عالم اسلام سے تعلق رکھنے والے مسلمان زندگی میں ایک دفعہ میدان عرفات میں جمع ہو جایا کریں۔

انسانی گروہوں کا اس طرح بار بار کہیں اکٹھے ہوتے رہنا انسانی زندگی کی گاڑی کے کامیابی سے چلنے میں ازحد مفید ثابت ہوتا ہے۔ اس سے انسانوں کو ایک دوسرے سے واقفیت حاصل ہوتی ہے اور واقفیت کی بناء پر باہمی انس و محبت پیدا ہوتی ہے۔ اس سے لوگ ایک دوسرے کا دکھ درد بٹانے اور ایک دوسرے کو امداد بہم پہنچانے کے قابل ہوتے ہیں۔ اس سے انسان ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھاتا ہے اور ملنے ملانے اور تبادلہ خیالات سے علمی ترقی حاصل کرتا ہے۔

حج کو فرض قرار دے کر اللہ رب العلمین نے مسلمانوں کو ایک ایسا مرکز بہم پہنچا دیا ہے، جو ہر سال دنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک جگہ اکٹھا کر دیتا ہے اور انہیں دینی، دنیاوی، انفرادی، اجتماعی، قومی، بین الاقوامی، جسمانی، روحانی ہر لحاظ سے بے پناہ فوائد اور خیر و برکت بہم پہنچاتا ہے۔ مسلمان بزرگوں اور دانشوروں نے اس کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے۔

اس میں سے کچھ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے کسی حد تک یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حج ایک ضروری عبادت ہونے کے علاوہ عالم اسلام کی اجتماعی زندگی کے لیے گوناگوں فوائد کا باعث بھی ہے۔

سید سلیمان ندوی سیرۃ النبیؐ جلد پنجم میں خانہ کعبہ کی مرکزیت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''خانہ کعبہ اس دنیا میں عرشِ الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا نقطہ قدم ہے۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں اس کی رحمت و غفاری کی صفتیں اپنا عکس ڈال کر تمام کرۂ ارض کو اپنی شعاعوں سے منور کرتی ہیں۔ یہ وہ منبع ہے جہاں سے حق پرستی کا چشمہ ابلا اور اس نے تمام دنیا کو سیراب کیا۔ یہ روحانی علم و معرفت کا وہ مطلع ہے جس کی کرنوں نے زمین کے ذرے ذرے کو درخشاں کیا۔ یہ وہ جغرافیائی شیرازہ ہے جس میں ملت کے وہ تمام افراد بندھے ہوئے ہیں جو مختلف ملکوں اور اقلیموں میں بستے ہیں، مختلف زبانیں بولتے ہیں، مختلف لباس پہنتے ہیں، مختلف تمدنوں میں زندگی بسر کرتے ہیں اور وہ سب کے سب ایک ہی خانہ کعبہ کے گرد چکر لگاتے ہیں، ایک ہی قبلہ کو اپنا مرکز سمجھتے ہیں اور ایک ہی مقام (یعنی مکہ مکرمہ) کو امّ القریٰ (بستیوں کی ماں) مان کر، وطنیت، قومیت، تمدن و معاشرت، رنگ و روپ اور دوسرے تمام امتیازات مٹا کر ایک ہی وطن (مکہ مکرمہ) ایک ہی قومیت (آل ابراہیمؑ) ایک ہی تمدن و معاشرت (ملتِ ابراہیمیؑ) اور ایک ہی زبان (عربی) میں متحد ہو جاتے ہیں، اور یہ وہ برادری ہے جس میں دنیا کی تمام قومیں اور مختلف ملکوں کے بسنے والے، جو وطنیت اور قومیت کی لعنتوں میں گرفتار ہیں، ایک لمحہ اور ایک آن میں داخل ہوتے ہیں، جس سے انسانوں کی بنائی ہوئی تمام زنجیریں اور قیدیں اور بیڑیاں کٹ جاتی ہیں اور تھوڑے دن کے لیے عرصہ حج میں تمام قومیں ایک ملک میں، ایک لباسِ احرام میں، ایک وضع

میں، دوش بدوش، ایک قوم بلکہ ایک خانوادے کی برادری بن کر کھڑی ہوتی ہیں اور ایک ہی بولی میں خدا سے باتیں کرتی ہیں۔"

سیرۃ النبیؐ جلد پنجم ہی میں سید صاحب ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

"یہ اسی کی مرکزیت کا نتیجہ ہے کہ عام مسلمان جو اپنے اپنے ملکوں میں اپنے اپنے حالات میں گرفتار ہیں۔ وہ دور دراز مسافتوں کو طے کر کے اور ہر قسم کی مصیبتوں کو جھیل کر، دریا، پہاڑ، جنگل، آبادی اور صحرا کو عبور کر کے یہاں جمع ہوتے ہیں، ایک دوسرے سے ملتے ہیں، ایک دوسرے کے درد و غم اور حالات سے آشنا ہوتے ہیں جس سے ان میں باہمی اتحاد اور تعاون کی روح پیدا ہوتی ہے۔ یہیں آ کر چینی مراکشی سے، تونسی ہندی سے، تاتاری حبشی سے، فرنگی زنگی سے، عجمی عربی سے، یمنی نجدی سے، ترکی افغانی سے، مصری ترکستانی سے، روسی الجزائری سے، افریقی یورپین سے، جاوی بلغاری سے ملتا ہے اور سب مل کر باہم ایک قوم، ایک نسل، ایک خاندان کے افراد نظر آتے ہیں۔"

یہ حج ہی کا موقع تھا جب حضورؐ نے مسلمانوں کے ایک عظیم الشان مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"لوگو، ہاں بے شک، تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے، ہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر پرہیزگاری کے سبب سے۔"

(مسند احمد)

نیز فرمایا:

"بے شک تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری آبرو آپس میں ایک دوسرے کے لیے اسی طرح محترم ہے جیسے تمہارے اس شہر میں،

تمہارے اس مہینے میں تمہارا یہ دن محترم ہے۔" (مسلم)

شہر سے مراد مکّہ مکرّمہ' مہینے سے مراد ذوالحجہ اور دن سے مراد حج کا دن ہے۔

سید ابوالحسن علی ندوی حج کی اسی خصوصیت پر کہ وہ عالم اسلام کے مختلف گوشوں اور علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں کو ملا کر ایک قوم بناتا ہے' تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"حج ان وطنی' نسلی' لسانی اور علاقائی قومیتوں کے خلاف اسلامی قومیت کی جیت ہے جن کے بہت سے اسلامی ممالک شکار ہیں۔ وہ اسلامی قومیت کا مظہر اور اعلان ہے۔ یہاں پہنچ کر تمام اسلامی قومیں اپنے قومی و ملکی لباسوں سے آزاد ہو کر' جو ان کی پہچان بن گئے تھے اور جن سے بہت سی قومیں تعصب کی حد تک وابستہ ہیں' اسلام کا ایک قومی لباس اختیار کر لیتی ہیں جسے احرام کہا جاتا ہے۔ سب عاجزی و انکساری اور گریہ وزاری کے ساتھ ایک ہی زبان میں ایک ہی نعرہ لگاتے ہیں۔

لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ۔

لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ'

اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ. لَکَ وَالْمُلْکَ'

لَاشَرِیْکَ لَکَ.

اس میں حاکم و محکوم' آقا و نوکر' امیر و فقیر اور چھوٹے بڑے کی کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ ان کے لباس و صدا دونوں میں اسلامی قومیت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ یہی حال حج کے دوسرے اعمال' عبادات' مناسک اور شعائر و مقامات کا ہے۔ جہاں ہر قوم و ملک کے لوگ دوش بدوش نظر آتے ہیں اور قریب و بعید اور عرب و عجم کے سارے فرق مٹ جاتے ہیں۔ صفا مروہ کی دو پہاڑیوں کے درمیان سب ساتھ دوڑتے ہیں' منیٰ ساتھ سفر کرتے ہیں'

عرفات ساتھ جاتے ہیں' ایک ساتھ متحرک ہوتے ہیں' ایک ساتھ ساکن ہوتے ہیں۔ منیٰ میں بھی قیام ایک ساتھ کرتے ہیں اور نحر (یعنی قربانی) حلق (یعنی سر منڈانا) اور رمی (یعنی شیطان کو کنکر مارنا) سارے کام ایک ساتھ انجام دیتے ہیں۔" (ارکان اربعہ)

آدمؑ کی اولاد کے دل میں اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے کی محبت کے رشتے قائم کر کے اس کی مشکل منزل میں آسانی پیدا کی ہوئی ہے۔ والدین کو بچوں سے محبت ہوتی ہے۔ رشتے داروں کو ایک دوسرے سے لگاؤ ہوتا ہے۔ پھر ہمسائگت' ہموطنی اور باہمی دوستی کی محبتیں ہیں۔ اس جذبہ محبت کے ذریعے انسان کی بہت سی مشکلات آسان ہوتی ہیں مگر جس محبت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اور جو انسانیت کی معراج سمجھی گئی ہے' وہ مخلوق کا خالق کو چاہنا ہے۔ حج اس ارفع محبت کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں:

"کبھی کبھی انسان کو اپنے رب کی طرف غایت درجہ اشتیاق ہوتا ہے اور محبت جوش مارتی ہے اور وہ اس شوق کی تسکین کے لیے اپنے چاروں طرف نظر دوڑاتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سامان صرف حج ہے۔" (حجۃ اللہ البالغہ)

اسی سلسلے میں امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

"اگر مسلمان کو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا شوق ہے تو وہ اس کے وسائل اختیار کرنے پر مجبور ہوگا۔ عاشق ہر اس چیز کا مشتاق ہوتا ہے جس کا تعلق اس کے معشوق سے ہو۔ خانہ کعبہ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے اس لیے مسلمان کو قدرتی طور پر اس کا سب سے زیادہ مشتاق ہونا چاہیے۔ علاوہ اس اجر و ثواب کی طلب اور حاجت کے' جس کا وعدہ بھی کیا گیا ہے۔" (احیاء العلوم)

روح و اخلاق کی اصلاح کے لیے جیسے نیک صحبت بہت مؤثر ہوتی ہے اسی طرح

یہ شے بھی مفید ہوتی ہے کہ جن سعید روحوں نے نیکوکاری کی زندگی گزاری ان کے سوانح حیات کو ذہن میں تازہ کیا جائے اور ان مقامات کو دیکھا جائے جہاں اللہ رب العلمین کی فرمانبرداری کے اعمال سرانجام دیے گئے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''حج کی حقیقت یہ ہے کہ نیک لوگوں کی ایک بڑی جماعت ایک خاص زمانے میں جمع ہو اور ان لوگوں کا حال یاد کرے جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا۔ مثلاً انبیاء اور صدیقین، شہداء اور صالحین اور اس جگہ جمع ہوں جہاں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں موجود ہیں اور جہاں ائمہ دین اور امت کے نیک لوگ شعائر اللہ کی تعظیم میں سرشار ہو کر گڑگڑاتے، روتے ہوئے خیر و بخشش کے طالب اور برائیوں کے کفارے کے امیدوار ہو کر آتے رہے۔'' (حجۃ اللہ البالغہ)

نیز فرماتے ہیں:

''یہ بات بھی طہارتِ نفس میں شامل ہے کہ آدمی ان جگہوں میں اترے اور قیام کرے جہاں نیکوکار لوگ اور اولیاء اللہ ہمیشہ سے دل کی تعظیم اور ارادے کے ساتھ اترتے آئے ہیں اور اس کو خدا کے نام سے معمور کرتے رہے ہیں۔ یہ اہلِ خیر کے حق میں فرشتوں اور ملاءِ اعلیٰ کو متوجہ کرنے کا باعث ہوگا اور جب وہ وہاں اترے گا تو ان کا رنگ اس پر بھی چڑھ جائے گا۔'' (حجۃ اللہ البالغۃ)

حج کے سفر نے مسلمانوں کے علم اور تجربے میں بھی بہت اضافہ کیا ہے، سید سلیمان ندوی حج کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اسی کا اثر تھا اور ہے کہ معمولی سے معمولی مسلمان بھی اپنے ملک سے باہر کی کچھ دنیا دیکھ آتا ہے۔ زمانے کے رنگ کو پہچاننے اور سیاسیات کی پیچیدگیوں کو سمجھنے لگتا ہے

ر بین الاقوامی معاملات میں دلچسپی لیتا ہے اور دنیا کے ہر اس گوشے کے حالات سے جس
کے منارہ سے اللہ اکبر کی صدا بلند ہو اس کو خاص ذوق ہوتا ہے اور اسی کا اثر ہے کہ ہر مسلمان
نیائے اسلام اور اسلامی ملکوں کے حالات و واقعات کے لیے بے چین نظر آتا ہے۔ پھر اسی
نتیجہ ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمانوں کی بھی اچھی خاصی تعداد ایسی ملے گی جس کو دنیا کے
ر کا کچھ تجربہ ہوگا اور خشکی اور تری سے کچھ واقفیت ہوگی۔"

مسلمانوں میں بڑے بڑے لائق جغرافیہ دان اور قابل سیاح ہوئے ہیں اور ان
ں بے شمار ایسے تھے جنہوں نے حج کا سفر اختیار کیا اور پھر یہیں سے انہیں جغرافیہ یا سیاحت
ں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ ایک مشہور مسلمان جغرافیہ دان "یاقوت" کا خیال ہے کہ مسلمانوں
ں جغرافیائی معلومات کی ترقی کا ایک بڑا ذریعہ سفرِ حج ہے۔

سفر حج نے مسلمانوں کی علمی ترقی پر جو اثر ڈالا اسے بیان کرتے ہوئے سید
یمان ندوی فرماتے ہیں:

"یہ اسی مرکزیت کا اثر ہے کہ بڑے بڑے صحابہؓ اور عالم، محدث، مفسر اور فقیہہ
اسلامی فتوحات اور نو آبادیوں کے سلسلے میں تمام دنیا میں پھیل گئے تھے، وہ سال بہ سال
آ کر یہاں سمٹ جاتے تھے اور تمام دنیا کے گوشوں سے آ کر حرم ابراہیمؑ میں جمع ہو جاتے
ے..... یہیں آ کر بخارا کا باشندہ سپین اور مراکش کے رہنے والوں سے، شامی، عراقی اور
ری حجازی سے، بصری کوفی سے، ترمذی نیشاپوری سے، اندلسی سندھی سے، روسی یمنی سے
ں پاتا تھا اور دم کے دم میں سندھ کا علم اسپین میں، اور اسپین کی تحقیق سندھ میں پہنچ جاتی
ا۔ مصر کی تصنیف و روایت ترکستان میں اور ترکستان کا فیصلہ مصر و شام میں پہنچ جاتا تھا.....
وہ مرکز تھا جہاں ائمہ مجتہدین باہم ایک دوسرے سے ملتے اور ایک دوسرے کے علم سے
اب ہوتے تھے۔" (سیرۃ النبیؐ جلد ۵)

غرض کہ حج ایک طرف فرد کے گذشتہ گناہ مٹا کر اسے ایک نئی اور گناہوں سے پاک زندگی عطا کرتا اور اس کے نفس کا تزکیہ کرتا ہے اور دوسری طرف اجتماعی طور پر عالمِ اسلام کو گوناگوں فوائد بہم پہنچاتا ہے۔

سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

''حج اسلام کا صرف مذہبی رکن نہیں بلکہ وہ اخلاقی' معاشرتی' اقتصادی' سیاسی یعنی قومی و ملی زندگی کے ہر رخ اور ہر پہلو پر حاوی اور مسلمانوں کی عالمگیر بین الاقوامی حیثیت کا سب سے بلند منارہ ہے۔'' (سیرۃ النبیؐ جلد پنجم)

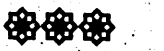

نئی زندگی

رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ''جس نے خدا کے لیے حج کیا اور (اس کے دوران) نہ کوئی فحش بات کی اور نہ کسی گناہ کا مرتکب ہوا تو وہ اس طرح (گناہوں سے پاک صاف ہو کر) لوٹے گا جیسے وہ اس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اسے جنم دیا تھا۔'' (بخاری)

اس حدیث پر غور کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ جہاں ایک عام انسان کو خدا تعالیٰ صرف ایک زندگی دیتا ہے جو اس کی ولادت سے شروع ہو کر اس کی وفات پر ختم ہوتی ہے۔ وہاں حاجی کو وہ گویا دو زندگیاں عطا فرماتا ہے۔ ایک وہ جو اس کی ولادت سے شروع ہو کر اس کے حج کرنے تک چلتی ہے اور دوسری وہ جو اس کے حج کر لینے سے شروع ہو کر اس کی وفات پر ختم ہوتی ہے اور جس طرح اس کی پہلی زندگی معصومیت سے شروع ہوئی تھی اس طرح اس کی دوسری زندگی بھی معصومیت ہی سے شروع ہوتی ہے کیونکہ حج کرنے کے باعث اس کی پہلی زندگی کے گناہ اس کے نامۂ اعمال سے محو کر دیے گئے ہوتے ہیں۔ پھر ایک معاملے میں تو اس کی دوسری زندگی پہلی زندگی سے بھی فائق ہوتی ہے۔ وہ اس طرح کہ پہلی زندگی کا تو بہت سا حصہ بچپن اور لڑکپن کی شکل میں بے شعوری میں کٹ گیا تھا، مگر دوسری زندگی تو شروع ہی شعور کے ساتھ ہوتی ہے۔

۸ ذوالحجہ کو جب آپ نے احرام باندھا تو گویا پہلی زندگی کو ختم کر کے کفن میں

ملبوس ہو گئے اور دس ذوالحجہ کو قربانی کر کے جب بال اتروائے تو گویا دوسری زندگی کا آغاز کر دیا۔ اب وہ پہلی زندگی تو اپنے تمام گناہوں اور خطاؤں سمیت ختم ہو گئی، لیکن

اب آگے کیا ارادہ ہے؟ واپسی کا سفر شروع کرتے ہی ذرا اپنا دل ٹٹول کر دیکھئے اور پھر بار بار اسے دیکھتے رہیے کہ اب وہ کس حالت میں ہے۔

کیا آپ کے دل میں اس بات کا احساس پیدا ہو گیا ہے کہ خدا نے آپ کو ایک نئی اور گناہوں سے پاک زندگی عطا کی ہے؟---یا کہ آپ اپنی پرانی اور نئی دونوں زندگیوں کے بارے میں بے حس ہیں؟

کیا آپ کے دل میں یہ تڑپ موجود ہے کہ اب جو گناہوں سے پاک زندگی ملی ہے اسے گناہوں سے بچائے رکھوں؟---یا کہ جن دنیاوی دھندوں کی طرف آپ واپس لوٹ رہے ہیں انہوں نے ابھی سے آپ کے ذہن کو اپنے آپ میں مصروف کر لیا ہے؟

کیا آپ کا دل مسرور اور شکر گزار ہے کہ زندگی کا ایک بہت بڑا فرض ادا ہو گیا؟---یا کہ اس سفر کے دوران آپ کے خیال کے مطابق جن لوگوں نے آپ سے "بے مروتی" برتی تھی ان کے خلاف دل شکووں اور شکایتوں سے بھرا ہوا ہے؟

کیا آپ کے دل میں وہ نرمی موجود ہے جو حج کے دوران پیدا ہوئی تھی؟---یا کہ اب اس نے سختی سے بدلنا شروع کر دیا ہے؟

کیا آپ کو ان مقامات کو چھوڑ آنے کا دکھ ہے جنہیں آپ شاید ہمیشہ ہی کے لیے چھوڑ آئے ہیں؟---یا کہ آپ اسی فکر میں غلطاں و پیچاں ہیں کہ جو غیر ملکی اشیاء آپ نے وہاں خریدی تھیں وہ وطن پہنچنے پر کسی طرح محصول سے بچ جائیں؟

ان سوالوں کا دیانتدارانہ جواب طے کر دے گا کہ آپ کے حج نے آپ کو صرف نئی زندگی ہی عطا کی ہے یا ساتھ اس قابل بھی بنا دیا ہے کہ اس نئی زندگی کو اپنی پہلی پرانی

زندگی کی نسبت زیادہ عقلمندانہ اور زیادہ دیندارانہ طریقے سے گزاریں۔

ایک سیدھی سادی عورت اپنی سیدھی سادی زبان میں حج پر گفتگو کر رہی تھی۔ موضوع زیر بحث یہ تھا کہ "حج کر لینے سے پہلے گناہ ختم ہو جاتے ہیں۔" وہ کہنے لگیں۔

"عمر بھر ہم لوگ گناہوں کی گٹھڑیاں باندھ باندھ کر رکھتے رہتے ہیں۔ اس خیال سے کہ حج کو جائیں گے تو یہ سب گٹھڑیاں وہاں پھینک آئیں۔ اب اگر تو خدا کی طرف سے وہاں پہنچنے کا موقع مل گیا تو پھر تو گٹھڑیاں وہاں پھینک ہی دی جاتی ہیں' لیکن اگر وہاں پہنچنے سے پہلے ہی خدا کا بلاوا آ جائے تو پھر فرشتے انہیں گٹھڑیاں کو اٹھا کر ہماری قبروں میں رکھ دیتے ہیں کہ جاؤ اپنا کیا دھرا ساتھ لے جاؤ۔"

ان بی بی نے بالکل درست بات کی کہ اگر حج کی توفیق ہو جائے تو پہلے کی باندھی ہوئی گناہوں کی گٹھڑیوں سے تو واقعی پیچھا چھوٹ جاتا ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اگر اس کے بعد احتیاط سے کام نہ لیا جائے تو مزید گٹھڑیوں کے بندھنے میں بھی کچھ دیر نہیں لگتی۔ ایسے "ہمت والے" بھی موجود ہیں جو واپسی کے سفر ہی میں پھر گٹھڑیاں رکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

ایک عورت سے ملاقات ہوئی' جس کا کہنا تھا کہ میں چوتھا حج کرنے آئی ہوں۔ جب تک وہ وہاں رہیں انہیں کبھی مطمئن یا مسرور نہ دیکھا گیا۔ وہ مسلسل مالی تنگی کی شاکی رہیں اور بعض ہمسفروں سے ان کی سخت کھٹ پٹ چلتی رہی۔ بعد میں ان کے میاں نے قافلے کے ایک شخص کو خود بتایا کہ ہم تو اس لیے بھی بار بار آتے ہیں کہ یہاں سے سونا لے جایا کریں اور اس طرح کچھ نفع حاصل کر لیا کریں۔ "کیا کریں بھائی صاحب" انہوں نے کہا۔ "ذمہ داریوں کا بوجھ بہت زیادہ ہے۔" ـــــ گویا ذمہ داریاں ناجائز کاموں کے لیے کافی جواز ہیں۔

جب ان سے کہا گیا کہ حکومت نے تو شدت سے اس کی ممانعت کر رکھی ہے اور بہت چھان بین ہوتی ہے تو آخر آپ سونے کو ہوائی اڈے سے باہر لاتے کیسے ہیں' تو انہوں نے جواب دیا کہ میری بیوی اس معاملے میں بہت ماہر ہو چکی ہیں۔ سونا ان کے جسم ہی پر کہیں ہوتا ہے مگر کیا مجال کہ کسی کو معلوم ہو جائے۔

یہ مثال تو خیر ان لوگوں کی تھی جن کے لیے حج پیسہ کمانے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے ایسے لوگ بھی جو بظاہر بڑے دیندار نظر آتے ہیں اور صرف حج کرنے ہی کی نیت سے وہاں جاتے ہیں' سنجیدگی سے اس بات کی طرف توجہ نہیں دیتے کہ خطاؤں کا جو بوجھ روح کے کندھوں سے اترا ہے وہ اب پھر نہ جمع ہونا شروع ہو جائے اور بعض لوگ تو اتنے بے نیاز واقع ہوتے ہیں کہ انہیں صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے حج کر لیا ہے۔ باقی نہ تو انہیں پہلی گٹھڑیوں کے پھینک دیے جانے کا کوئی احساس ہوتا ہے اور نہ نئی گٹھڑیاں بندھتی نظر آتی ہیں۔

ہاں وہ خوش بخت' دانا لوگ کہ جب ایک دفعہ ان کا نامہ اعمال صاف ہو گیا تو پھر وہ انتہائی چوکس ہو گئے کہ اب حتی الامکان اس پر کوئی سیاہی نہ آنے پائے۔ حج کا پورا فائدہ یہی عقل مند لوگ اٹھاتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ حج کی سعادت صرف صحت اور دولت ہی کی بناء پر حاصل نہیں کی جاتی بلکہ اس کا حصول تو صرف خدا کی رحمت پر منحصر ہوتا ہے۔ بسا اوقات بڑے بڑے دولت والے اس السعادت سے محروم دنیا سے چلے جاتے ہیں اور بعض غریب لوگ اس خوش بختی کو حاصل کر لیتے ہیں۔ اب جس خوش قسمت کو یہ نعمت حاصل ہو جائے اس کے لیے لازمی ہے کہ اپنے رحیم و کریم خالق کا شکر گزار ہو۔

شکر کے بارے میں قرآن و حدیث میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس کی روشنی میں شکر

کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ قلبی شکر، قولی شکر اور عملی شکر۔ قلبی شکر یہ ہے کہ دل میں اچھی طرح اس بات کا احساس ہو کہ خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ہمیں یہ نعمت عطا کی ہے۔ قولی شکر یہ ہے کہ زبان سے شکر کا اظہار کیا جائے اور عملی شکر یہ ہے کہ جو نعمت عطا ہوئی ہے، اس کے تقاضے پورے کیے جائیں۔

لہٰذا حج کی توفیق ملنے پر شکر کرنے کا مفہوم بھی یہی ہوگا کہ دل سے اس بات کا احساس ہو کہ ہمیں حج کی توفیق عطا کر کے خدا تعالیٰ نے ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے اور زبان سے اس کی اس نعمت کا اعتراف اور اپنی شکر گزاری کا اظہار کیا جائے اور عملی طور پر اس نعمت کا تقاضا پورا کرنے کی طرف توجہ رہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ گناہوں سے پاک جو نئی زندگی ملی ہے اسے گناہوں سے بچانے کی پوری پوری کوشش کرتے رہیں۔

حج کے بعد اپنی روزمرہ کی زندگی میں وقتاً فوقتاً اپنا محاسبہ کرتے رہنا نہایت ضروری ہے۔ ذرا غور تو کریں کہ حج نے ہماری زندگی میں کہاں تک تبدیلی پیدا کی ہے۔

۱۔ کیا اب ہم شرائطِ نماز کو ملحوظ رکھتے ہوئے نماز پنجگانہ کے پابند ہیں؟

۲۔ کیا اب ہم رمضان کے روزے پوری پابندی سے رکھتے ہیں؟

۳۔ کیا اب ہم اپنے مالوں کی زکوٰۃ کے بارے میں "وہمی" ہونے کی حد تک فکر مند رہتے ہیں؟

۴۔ کیا اب ہمارے دل کو، جو خانہ ویراں ہوا کرتا تھا، خدا اور خدا کے رسول کی محبت نے آباد کر رکھا ہے؟

۵۔ کیا اب ہمیں اس دنیوی زندگی کی اہمیت اور اختصار دونوں کا اتنا پتہ چل گیا ہے کہ ہم نے لایعنی کام اور لایعنی کلام چھوڑ دیے ہیں؟

۶۔ کیا ہم نے ذاتوں، برادریوں، قبیلوں، علاقوں اور زبانوں کے تعصبات سے آزاد

ہو کر خالص اسلام کی بنیاد پر لوگوں سے محبت کرنی شروع کر دی ہے؟

۷۔ کیا ہماری ''میں'' میں کوئی کمزوری واقع ہوئی ہے؟ کیا ہم اس پست سطح سے کچھ اوپر اٹھے ہیں جہاں اپنی جھوٹی آن کا احساس ہمیں ذرا ذرا سی بات پر مشتعل کر دیا کرتا تھا اور لوگوں سے اپنی ''بڑائی'' منوانے کی خاطر ہم بڑی ہی ''چھوٹی'' حرکات کرنے پر تلے رہتے تھے۔؟

۸۔ کیا ہم میں اتنا حوصلہ اتنا علم اتنا جذبہ عفو پیدا ہو گیا ہے کہ انسانوں کی زیادتیوں کو نظر انداز کر کے ان سے تعلقات قائم رکھنے ہی کو اپنی کامیابی سمجھیں؟

۹۔ کیا ہم نے حقوق، حقوق چلاتے رہنے کے بجائے فرائض ادا کرنے کی طرف توجہ دینی شروع کر دی ہے؟

۱۰۔ کیا ہمیں یہ فکر رہتی ہے کہ جو آمدنی گھر میں آ رہی ہے، وہ پوری پوری حلال روزی ہو؟

۱۱۔ کیا یہ کترنی کی طرح چلتی رہنے والی زبان پر جو ہر وقت کچھ نہ کچھ کترتی ہی رہا کرتی تھی، کچھ قابو میں آئی ہے؟

۱۲۔ کیا ہماری سمجھ میں یہ بات آ گئی ہے کہ خود پسندی کے مقابلے میں انسان دوستی بہت ارفع چیز ہے اور جھگڑے مٹانے کے لیے جھک جانا شکست کھانا نہیں بلکہ فتح حاصل کرنا ہے؟

۱۳۔ کیا ہمارے دل سے عہدہ و جاہ اور شہرت و دولت کی حرص کم ہوئی ہے؟ ہمیں پتہ چلا ہے کہ چھوٹا اور گمنام بن کر رہنے میں عافیت بھی ہے، اور انشاء اللہ آخرت بھی۔

۱۴۔ کیا ہمارے فخر و غرور میں کوئی کمی آئی ہے؟ ہم نے اپنی اصلیت پہچانی ہے؟ ہم میں وہ انکسار پیدا ہوا ہے جو خدا اور خدا کے رسولؐ کو پسند ہے؟

۱۵۔ کیا ہمارے دلوں سے اپنے متعلقین کی ''زیادتیوں'' کے شکوے کم ہوئے ہیں؟ کیا ہم نے ان کی ''زیادتیوں'' کے ساتھ اپنی زیادتیاں بھی دیکھنی شروع کی ہیں؟

اب اگر ہم میں یہ تبدیلیاں آ گئی ہیں یا ان کا کچھ حصہ بھی نظر آ رہا ہے تو پھر اس مالک کا کروڑ کروڑ بار شکر، جس نے پہلی خطائیں بھی مٹائیں اور آگے سے بھی توفیق نیک عطا فرمائی۔

اور اگر ہم ویسے ہی ہیں جیسے حج کرنے سے پہلے تھے، تو پھر اے دل تجھ پر تف ہے کہ جس خانہ پاک کی طرف لوگ دور سے منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں، تو اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہے مگر پھر بھی تجھ میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔

وہ جو تو نے شیطان کو پورے ستر کنکر مارے تھے اور بار بار عہد کیا تھا کہ اب اس کی بات نہیں مانوں گا، وہ تیرا عہد کیا ہوا؟

کیا تو نے اللہ کے پاک گھر کے گرد والہانہ چکر نہیں لگائے تھے، مدفن پاک کے آگے کھڑے ہو کر درود و سلام نہیں پڑھا تھا، عرفات کے میدان میں تضرع و زاری نہیں کی تھی۔ مکہ مکرمہ سے منیٰ، منیٰ سے عرفات، عرفات سے مزدلفہ اور مزدلفہ سے پھر منیٰ۔ ''میں حاضر ہوں، اے خدا میں حاضر ہوں۔'' نہیں پکارتا پھرا تھا؟

کیا تیرے رؤف و رحیم خالق نے تجھے مسجد نبویؐ کی ایک ایک نماز کے بدلے ہزار ہزار نماز اور مسجد حرام کی ایک ایک نماز کے بدلے لاکھ لاکھ نماز کا ثواب عطا نہیں کیا تھا؟

ایسے پکے عہد کرنے کے بعد، ایسے متبرک مقامات کی زیارت سے سرفراز ہو چکنے کے بعد اور ایسے ایسے انعامات پا لینے کے بعد آخر تو ویسے کا ویسا کیسے رہ گیا جیسا پہلے تھا؟

کیا تو صرف اس لیے گیا تھا کہ گذشتہ گناہوں کو معاف کروا لے؟ آئندہ کے لیے گناہوں کے آگے بند باندھنے کی توفیق اور طاقت حاصل کرنا تیرا مقصود نہ تھا؟

یاد رکھ کہ ایک عام متوسط درجے کی حیثیت کا مالک مسلمان زندگی میں صرف ایک دفعہ حج کرتا ہے۔ اس بات کا بہت کم امکان ہوتا ہے کہ یہ سعادت اسے دوبارہ نصیب ہو۔ اس لیے اب دوبارہ گٹھڑیاں نہ باندھ۔ اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ اب کے یہ گٹھڑیاں تیرے ساتھ ہی تیری قبر میں رکھ دی جائیں گی!!!

انسان کی تخلیق کا مقصد خدا کی بندگی ہے

بزم بتول اور ادارۂ بتول کی کتب اسی مقصد کی خاطر لکھی جاتی ہیں۔

زندگی بے بندگی شرمندگی	حصہ اول	آخرت	از بنت الاسلام
" " " " "	حصہ دوم	حب الٰہی	" " " " "
" " " " "	حصہ سوم	داعی کے اوصاف	" " " " "
" " " " "	حصہ چہارم	نفس کا تزکیہ	" " " " "
" " " " "	حصہ پنجم	صلوٰۃ وزکوٰۃ	" " " " "
" " " " "	حصہ ششم	صیام رمضان وحج بیت اللہ	" " " " "
" " " " "	حصہ ہفتم	حقوق العباد	" " " " "
" " " " "	حصہ ہشتم	علم	" " " " "
" " " " "	حصہ نہم	اسلامی اخوت	" " " " "
" " " " "	حصہ دہم	قوتیں	" " " " "
" " " " "	یازدہم	سراجا منیرا	" " " " "

(سلسلہ اخلاق اسلامی)

صبر	از بنت الاسلام
عفو	عفت قریشی
زبان کی حفاظت	بنت الاسلام

انسان دوستی	بنت الاسلام	
رحم دلی	" " " " " "	

(مجموعے)

انوار القرآن	(مجموعہ آیات)	از عفت قریشی
اسوۂ حسنہ	حصہ اول	از بنت الاسلام
" " " " "	حصہ دوم	" " " " "
" " " " "	حصہ سوئم	" " " " "
صادقہ	(مجموعہ احادیث)	
ربنا	(دعاؤں کا مجموعہ)	از عفت قریشی

(ناول اور افسانے)

ذرا نم ہو تو یہ مٹی	از بنت الاسلام (ناول)
وہ غم اور ہوتے ہیں	(ناول)
سہارا	(ناول)
زر سے ذات	(ناول) از عفت قریشی

(بچوں کی کتب)

ہمارے نبیؐ	از بنت الاسلام
سیدناؓ	" " " " " " " "
باقی کون رہے گا	از فرات احسن (منظوم کہانیاں)

☆ ☆ ☆